روزے کی بادشاہی

روزہ کیا ہے، اسے ایک جملے میں بیان کیا جائے تو یہ اپنے اوپر بادشاہی کرنے کا نام ہے۔ بلاشبہ اپنے اوپر بادشاہی کرنے سے زیادہ بڑی نعمت اس دنیا میں کوئی نہیں۔

انسان اور جانور میں ایک بنیادی فرق یہ ہے کہ جانور جبلتوں میں جیتے ہیں۔ انھیں بھوک لگتی ہے تو وہ خوراک کی تلاش میں نکل کھڑے ہوتے ہیں۔ پیاس لگتی ہے تو پانی کے تالاب کا رخ کرتے ہیں۔ یہی معاملہ دیگر جبلتوں کا ہے۔ ان کی جبلتیں ان پر حکمران ہوتی ہیں۔ ان کے لیے وہ لڑتے ہیں، مرتے ہیں اور دوسرے جانوروں کو مار ڈالتے ہیں۔

یہی معاملہ انسان کا ہے جس کو اس دنیا میں ایک حیوانی قالب دے کر بھیجا گیا ہے۔ اس حیوانی قالب کی بنا پر انسان بھی اپنی جبلتوں کے ماتحت ہوتے ہیں۔ لیکن ساتھ ہی اللہ کی طرف سے انسانوں کو خیر و شر کا شعور اور مذہب کی رہنمائی ملی ہوتی ہے۔ یوں انسان اپنی جبلت سے لڑ کر اسے کچھ حدود و قیود میں رکھنے کی کوشش کرتا ہے لیکن اسے اکثر اس میں ناکامی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ انسان حلال و حرام سے بے پروا ہو جاتا ہے۔ دوسروں کا حق مارتا اور ان پر ظلم کرتا ہے۔ یوں انسان پر حیوان غالب آ جاتا ہے۔

روزہ اسی حیوانیت کو نکیل ڈالنے کا نام ہے۔ اس کا ون پوائنٹ ایجنڈا یہی ہے کہ کھانا، پانی اور بیوی تینوں سے رک جاؤ۔ یہ تینوں کام کسی پہلو سے عبادت نہیں۔ مگر یہ کرنے سے انسان کو خود پر کنٹرول کرنے کی صلاحیت کا علم ہو جاتا ہے۔ ایک دفعہ اس صلاحیت کا علم ہو جائے تو انسان پھر اس صلاحیت کو ہر جگہ استعمال کر سکتا ہے۔ اپنے کھانے کو چھوڑنے والا دوسرے کا مال کیسے کھا سکتا ہے۔ اپنے پانی کو چھوڑنے والا دوسرے کی کسی چیز کی طرف کیسے بری نظر ڈال سکتا ہے۔ اپنی بیوی سے دور رہنے والا پرائی عورت کی طرف کیسے دیکھ سکتا ہے۔

اپنے نفس پر کنٹرول کی یہ صلاحیت ہی وہ بادشاہی ہے جس کا نتیجہ جنت کی ابدی بادشاہی ہے۔ بلاشبہ اس سے بڑی کوئی نعمت خالق کائنات نے تخلیق نہیں کی ہے۔

ابدی روزہ

اللہ تعالیٰ نے انسان کو جس فطرت پر پیدا کیا ہے وہ اپنی ذات میں اس کی بہت کچھ رہنمائی کرتی ہے۔اس فطرت کے مطابق انسان جو کچھ کرتا ہے اسے اللہ کا قانون فطرت کہا جاتا ہے۔انسان اسی فطرت کے تحت کھاتا ہے پیتا ہے،شادی کرتا ہے،اولاد حاصل کرتا ہے،گھر بناتا اور بہت سے دیگر کام کرتا ہے۔ یہ تمام امور اتنے فطری ہوتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے بتائے بغیر جائز ہو جاتے ہیں اوراس کے کہے بغیر اللہ کا حکم بن جاتے ہیں،(البقرہ 222:2)۔

رمضان کا مہینہ آتا ہے تو اللہ تعالیٰ بندوں کا عجب طرح سے امتحان لیتے ہیں۔وہ اس فطری قانون کے تحت جائز چیزیں یعنی کھانا، پینا اور میاں بیوی کا تعلق ایک خاص وقت کے لیے ناجائز کر دیتے ہیں۔ بندے رب کا حکم سنتے ہیں اوراس کی اطاعت کا اظہار کرتے ہوئے اپنی فطری ضروریات سے بھی رک جاتے ہیں۔اللہ تعالیٰ اس پر اتنا خوش ہوتے ہیں کہ احادیث کے مطابق جنت میں ان کے لیے ایک خاص دروازہ بنا دیتے ہیں۔ان کی منہ کی بو کو خوشبو سے زیادہ پسند کرتے ہیں۔ان کو روزہ کی جزا خود دینے کا وعدہ کرتے ہیں اوراپنی ملاقات کے وقت ایک خاص خوشی ملنے کی خوش خبری سناتے ہیں۔

اس دنیا میں کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو خدا کے قانون ابتلا کے تحت قانون فطرت کی جائز کردہ بہت سی نعمتوں سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو جاتے ہیں۔ بہت سی بہنوں کی شادیاں نہیں ہو پاتیں۔ بہت سے لوگ معذور رہتے ہیں۔ بہت سے لوگ عمر بھر مریض رہتے ہیں۔ بہت سے لوگ تا زیست غربت کا شکار رہتے ہیں۔ کچھ کے ہاں اولاد نہیں ہوتی۔

ایسے تمام لوگ ابدی طور پر روزے کی حالت میں ہیں۔ان کو جب ان کے صبر کا اجر ملے گا تو ہر روزہ دار حیران رہ جائے گا۔اس روز ان کا اجر ناپنے کے لیے ہر پیمانہ چھوٹا پڑ جائے گا۔

روزہ اور خواتین

رمضان میں خواتین اپنی فطری وجوہات کی بنا پر کچھ روزے نہیں رکھ پاتیں۔ یہ صورتحال اگر آخری عشرے میں ہو جائے تو شب قدر سے محرومی کا خوف بھی خواتین کو تکلیف میں مبتلا کر دیتا ہے۔ جبکہ کچھ خواتین یہ خیال کرتی ہیں کہ ان دنوں میں روزہ نماز نہیں تو باقی بھی چھٹی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ان ایام میں روزہ نماز ممنوع ہیں لیکن اللہ تعالیٰ کے قرب کا ہر دروازہ ویسے ہی کھلا ہوتا ہے جیسے عام دنوں میں۔ نماز کی اصل ذکر الٰہی ہے۔ دعا عبادت کی جان ہے۔ قرآن کو ترجمے سے سمجھنا اصل مقصد ہے۔ یہ سارے دروازے ہر حال میں کھلے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ خواتین کے یہ ایام ایک عظیم یاد دہانی کا موقع ہیں۔ وہ یہ کہ خواتین کی یہ کیفیت اللہ کی طرف سے ہے۔ اس پر کوئی گرفت نہیں۔ مگر ایک دوسری چیز ہے جس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے سخت ترین گرفت بلکہ جہنم کی وعید ہے۔ وہ ہے اخلاقی ناپاکی۔ یہ اخلاقی ناپاکی کیا ہے، دین اسی سوال کا جواب تفصیل سے دیتا ہے۔ یہ اپنے ایمان کو ماحول میں پھیلے ہوئے تعصّبات سے آلودہ کرنا ہے۔ یہ اپنی سیرت کو حسد، تکبر، حرص، نفرت، بخل اور ان جیسے دیگر پست جذبات سے داغ دار کرنا ہے۔ دین بالکل واضح ہے کہ جو شخص اس طرح کی اخلاقی ناپاکی اختیار کرے گا وہ جنت میں داخلے سے محروم رہ جائے گا۔

خواتین کو ان دنوں میں یہ دیکھنا چاہیے کہ ان میں کون سی اخلاقی ناپاکی ہے جو وہ دن رات اپنی مرضی سے اختیار کیے ہوئے ہیں۔ اللہ کو اپنی بندیوں کی جسمانی ناپاکی سے کوئی مسئلہ نہیں مگر ان کی اخلاقی ناپاکی اسے سخت ناپسند ہے۔ کل قیامت کے دن وہ ہر اس عورت کو اپنے قرب سے محروم کر دے گا جو اخلاقی طور پر ناپاک ہوگی۔

جو خاتون اپنی جسمانی ناپاکی کو دیکھ کر اپنی اخلاقی ناپاکی سے نجات پالے، وہ دنیا کی خوش نصیب ترین خاتون ہے کیونکہ کل اس کا رب اسے جنت میں اپنے قدموں میں جگہ دے گا۔

انانیت، نفسانیت اور روزہ

انسان جنت کی راہ کا ازلی مسافر ہے۔ روزِ ازل جب اس نے بارِ امانت کو اٹھانے کا فیصلہ کیا تو اس مشقت کو جھیلنے کا اصل مقصد جنت کی ابدی بادشاہی کو حاصل کرنا تھا۔ زمین سے لے کر آسمان تک پھیلی ہوئی خدا کی عظیم سلطنت میں حکومت کرنے کا پروانہ حاصل کرنا تھا۔ یہ وہ اعزاز تھا جو نہ فرشتوں کو ملا نہ جنوں کو۔ نہ آسمان اس سفر میں اترنے کی ہمت کر سکا نہ زمین۔ نہ پہاڑ اس بلندی کو پہنچ سکے اور نہ سمندر اس کا حوصلہ کر سکا۔

جنت کی یہ منزل ایک سیدھے رستے پر واقع ہے۔ سیدھا راستہ یہ ہے کہ زندگی کے ہر موڑ پر جہاں رب کا حکم آئے گا، انسان وہی رخ اختیار کرے گا جو رب کو پسند ہو گا۔ اس سیدھے رستے میں اصل رکاوٹ انسان کے اندر سے آتی ہے۔ اور دو پہلوؤں سے آتی ہے۔ ایک یہ کہ انسان اپنے نفس کے تقاضوں، مفادات اور خواہشات کا اسیر ہو جاتا ہے۔ دوسری یہ کہ انسان انانیت کا شکار ہو کر سچائی کا انکار کر دیتا ہے۔ چنانچہ ان دو پہلوؤں سے انسانوں کی مدد کے لیے اللہ تعالیٰ نے رمضان کا مہینہ مقرر کیا جس میں دو عبادات ان دونوں مسئلوں کا علاج کرتی ہیں۔ شرط یہ ہے کہ انسان ان عبادات کو ان کی حقیقی روح کے ساتھ ادا کرے۔ ایک روزہ جو فرض اور دوسرا نفل نماز جس کا قیام بڑی فضیلت اور اجر کا باعث ہے۔

روزہ انسان کو نفس اور اس کے تقاضوں کے خلاف جنگ کرنا سکھاتا ہے۔ یہ انسان کو بتاتا ہے کہ انسان کا ارادہ اتنا طاقتور ہے کہ وہ اپنے آپ سے لڑ کر اپنی بنیادی ضرورت بھوک اور پیاس اور اپنی بنیادی خواہش یعنی میاں بیوی کے تعلق سے خود کو روک سکتا ہے۔ جو انسان ان جائز اور ضروری چیزوں سے خود کو روکنے کی شعوری تربیت کر لے، کیسے ممکن ہے کہ وہ رب کی نافرمانی کے ان کاموں میں مبتلا ہو جائے جو نہ ضروری ہوتے ہیں اور نہ عقل و فطرت ان کی اجازت دیتی ہے۔ اس کے ساتھ نماز اور خاص کر رات کی نفل نماز جو کہ عام نمازوں سے طویل ہوتی ہے وہ

انسان کی انانیت کو ختم کرنے میں معاون ثابت ہوتی ہے۔

نماز دراصل اللہ کی کبریائی بیان کرنے کا نام ہے۔ اللہ اکبر اس کا سب سے زیادہ دہرایا جانے والا کلمہ ہے۔ یہ اعتراف اور جھکاؤ کا نام ہے۔سورہ فاتحہ میں اللہ کی نعمتوں کا بار بار اعتراف کر کے اور قیام، رکوع، سجدے اور قعدے میں ہر ہر پہلو سے جھکے رہنے کی تربیت انسان میں عام زندگی میں بھی اعتراف اور جھکے رہنے کی صفت پیدا کرتی ہے۔ یہی دو چیزیں انسان کی انا کو قابو میں رکھتی ہیں۔

انسانی انا کے دو بنیادی مسائل ہیں۔ایک یہ کہ یہ عتراف نہیں کرتی۔اپنی غلطی ہو یا کسی دوسرے کی خوبی اور بڑائی کا اعتراف کرنا ہو، انسان ان دونوں موقعوں پر پیچھے ہٹ جاتا ہے۔ آدمی بڑی سے بڑی غلطی کا ارتکاب کرتا ہے اور جب توجہ دلائی جاتی ہے تو بجائے غلطی ماننے کے وہ چند بے معنی الفاظ بول کر اور بے وقعت تاویل کر کے اپنی غلطی ماننے سے انکار کر دیتا ہے۔ یہ انا کی وجہ سے ہوتا ہے۔اس کی سب سے بڑی مثال شیطان ہے جس نے نہ صرف اللہ کا حکم ماننے سے انکار کر دیا بلکہ جب اسے توجہ دلائی گئی تو اس نے اپنی غلطی ماننے سے صاف انکار کر دیا۔

اسی طرح انسان دوسروں کی خوبی اور بڑائی کا اعتراف کرنے میں ہمیشہ بخل سے کام لیتے ہیں۔ مثال کے طور پر لوگ اپنے زمانے کے بڑے سے بڑے آدمی کو معمولی آدمی سمجھ کر اس کی غلطیاں اور کمزوریاں نکالتے رہتے ہیں اور اس کی خوبیوں کو نہیں سراہتے ۔ اسی طرح ایک ہی شعبہ کے لوگ اپنے سوا دوسروں کی خوبی کا کم ہی اعتراف کرتے ہیں۔ اس کے بجائے انسان ہمیشہ خود کو نمایاں کرنے، اپنی تعریف سننے اور اپنے آپ کو اہم سمجھنے کو پسند کرتے ہیں۔لیکن یہ بھی شیطان کا طریقہ ہے جس نے آدم کا اعتراف کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس کا انجام اللہ کی ناراضی اور ابدی جہنم ہے۔ رمضان میں روزہ اور نماز دراصل انھی دو کمزوریوں سے نجات دلا کر انسانوں کو جہنم سے بچاتے اور جنت کی راہ کا مسافر بناتے ہیں۔

سب سے بڑی نیکی

اس دنیا میں کسی پیغمبر کی دعوت پر ایمان لانا سب سے بڑی نیکی ہے۔ نسلی مسلمانوں کو جہاں مسلمان پیدا ہونے کے متعدد فائدے ہیں، وہاں ان کو یہ نقصان ہے کہ وہ کبھی اس طرح ایمان نہیں لا سکتے۔ وہ تو پیدا ہی مسلمانوں کے ہاں ہوتے اور ہوش سنبھالنے سے قبل ہی اسلام کو دین حق کے طور پر قبول کر لیتے ہیں۔

تاہم ایک دوسرے پہلو سے یہ سب سے بڑی نیکی کمانے کا موقع آج بھی موجود ہے۔ مگر اس کے لیے ایمان کی روح کو سمجھنا ہوگا۔ ایمان کی روح سچائی کا اعتراف ہے۔ اپنے تعصّبات سے اوپر اٹھ کر سچائی کو ماننا۔ اپنے مفادات اور خواہشات سے بلند ہو کر سچائی کو قبول کرنا۔ اپنی انا، اپنی پسند، اپنے ذوق اور اپنے جذبات کو پیچھے رکھ کر سچائی قبول کرنا۔

ایمان کی یہ روح اگر واضح ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہمارے لیے بھی اس سب سے بڑی نیکی کو حاصل کرنے موقع موجود ہے۔ مگر اس کے لیے ہمیں اپنے گروہی تعصّبات، مفادات، خواہشات، اپنی انا اور پسند و ناپسند کو پس پشت ڈال کر سچ کو قبول کرنا ہوگا اور حق کا اعتراف کرنا ہوگا۔ ظاہر ہے کہ یہ کوئی آسان کام نہیں۔ اس کے لیے ہمیں اپنی کچھ تربیت کرنا ہوگی۔ اس تربیت کے اصول درج ذیل ہیں۔

عام طور پر ہم لوگوں کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ اپنے نقطہ نظر سے مختلف نقطہ نظر جب سامنے آتا ہے تو ہم اس سے ایک وحشت محسوس کرتے ہیں۔ ہم پہلی کوشش یہ کرتے ہیں کہ ایسی چیزوں کو سنیں اور پڑھیں ہی نہیں۔ اگر پڑھیں تو بلا سوچے سمجھے رد کر دیں۔ اور اگر سوچیں بھی تو صرف اس لیے کہ پڑھتے ہوئے ہر مختلف، اجنبی اور نئی بات کا جواب سوچتے رہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ رویہ سچائی کو جاننے کے لیے سم قاتل کی حیثیت رکھتا ہے۔ درست طریقہ

یہ ہے کہ پہلے پوری دیانت داری کے ساتھ کسی شخص کی بات کو سننا اور سمجھنا چاہیے۔اس کے دلائل جاننے چاہییں۔ جب یہ مرحلہ پورا ہوجائے تو پھر یہ تجزیہ شروع ہونا چاہیے کہ یہ بات درست ہے بھی یا نہیں۔

ہماری دوسری اہم غلطی یہ ہوتی ہے کہ ہم ہر مرحلے پر یہ فرض کرلیتے ہیں کہ ہم حق پر ہیں اور باقی سب لوگ باطل ہیں۔ جو ہم نے سن لیا سمجھ لیا وہ آخری سچائی ہے۔جبکہ ممکن ہے سچائی ہمارے نہیں دوسرے شخص کے پاس ہو۔جبکہ عین ممکن ہے کہ ہم کنویں کے وہ مینڈک ہوں جو کنویں سے باہر کی دنیا سے واقف نہ ہوں اور جو شخص ایک مختلف بات بیان کررہا ہے وہ سمندر کی آزاد مچھلی کی طرح ہر مدوجزر اور سرد وگرم سے واقف ہو۔مگر ہم اپنے کنویں کو دنیا سمجھتے ہیں۔اس کے بعد ہم گفتگو اور مباحثے میں دلیل کے جواب میں نکتہ آفرینی اور غیر متعلق مباحث چھیڑ کر بحث میں شکست سے بچ جاتے ہیں۔مگر درحقیقت یہ رویہ ہمارے لیے جنت کے دروازے بند کرکے جہنم کے دروازے کھول دیتا ہے۔

ہماری تیسری بنیادی غلطی یہ ہوتی ہے کہ جب ہمیں ہماری کسی شخصی کمزوری کی طرف توجہ دلائی جاتی ہے، ہم کو غصہ آجاتا ہے۔ہم اپنا جائزہ لینے کے بجائے کوشش کرتے ہیں کہ مخالف فریق پر کوئی الزام لگادیں۔اس میں ہم صحیح غلط کی تمیز بھی نہیں کرتے۔ یوں ہم اپنی جگہ تو مطمئن ہوسکتے ہیں کہ ہم نے مخالف کو ناک آؤٹ کردیا،مگر اس عظیم نیکی سے محروم رہ جاتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ خدا کی دنیا امتحان کی دنیا ہے۔ یہ امتحان جس طرح عمل کا ہے اسی طرح فکر کا بھی ہے۔جس طرح غیر مسلموں کو ایمان کے امتحان سے گزرنا ہے،ہمیں بھی اسی امتحان سے گزرنا ہے۔مگر ہمارے ہاں اس امتحان کا نام ایمان نہیں اعتراف ہے۔جس کے پاس اعتراف ہے وہی جنت میں جائے گا اور جس کے پاس نہیں ہے وہ جہنم کا مستحق ہے۔

قراردادمقاصد

پچھلے کافی عرصے سے ہمارے ہاں قرارداد مقاصد پر بہت کچھ بحث ومباحثہ ہورہا ہے۔ تاہم اس قضیے کو ہم اہل علم ودانش پر چھوڑ کر اس خاص قرارداد مقاصد پر کچھ گفتگو کرنا چاہیں گے جس پر ہماری نجات موقوف ہے۔ یہ وہ قرارداد مقاصد ہے، جو عالم کے پروردگار نے اپنے ماننے والوں کے سامنے خود رکھی ہے، مگر بیشتر مسلمان خود کو اس سے فارغ سمجھتے ہیں۔ یہ قراردادِ مقاصد یا دوسرے الفاظ میں نصب العین کیا ہے، اسے قرآن نے کئی مقامات پر تزکیہ نفس کے عنوان سے بیان کیا ہے اور پورا قرآن اسی کی تفصیل پر مشتمل ہے۔

اس قرارداد مقاصد کا پہلا ہدف اپنے نظریات کو پاک کرنا ہے۔ اصطلاحاً اسے ایمان کہتے ہیں۔ آج کے مسلمانوں کا خیال یہ ہے کہ ایمان لانا غیر مسلموں کا کام ہے یا دوسرے فرقے کے لوگوں کا کہ وہ ان کے فرقے اور اکابرین کی عظمت پر ایمان لے آئیں۔ لے آئیں گے تو ان کے ساتھ فرقہ ناجیہ کا حصہ بنیں گے، ورنہ کفار کے ساتھ جہنم رسید ہوں گے۔ جو لوگ فرقہ واریت سے کچھ بلند ہیں وہ اپنے نظریات کے متعلق یہی رائے رکھتے ہیں۔ لیکن قرآن مجید کے مطابق ایمان؛ سچائی کو اپنے تعصّبات، مفادات، خواہشات کے خلاف جا کر ماننے کا نام ہے۔ یہ اپنے فرقے، اکابرین اور اپنی پسند و ناپسند سے بلند ہو کر حق کا ساتھ دینے کا نام ہے۔ جو ہمارا رویہ ہے قرآن مجید کے مطابق یہ رویہ یا تو کفار مکہ کا تھا یا یہود مدینہ کا۔ مگر بہرحال ہمیں پھر بھی یقین ہے کہ جہنم کفار اور دیگر گمراہ فرقوں کا مقدر ہے۔ ہمارے لیے تو جنت کی مہمانی تیار ہے۔

اس قرارداد مقاصد کا دوسرا بنیادی جز عمل صالح کے ذریعے سے اپنی شخصیت اور اخلاق کو ظلم و زیادتی، منکر و معصیت، فحش و بے حیائی اور شرک و بدعت سے پاک کر کے عدل، احسان، انفاق، حیا اور بندگی کے اعلیٰ اصولوں پر ڈھالنا ہے۔ بدقسمتی سے یہاں بھی ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ ہم

نے کہیں پر عمل صالح کا اطلاق بدل دیا اور کہیں پر اس کی روح پامال کردی ہے۔ نماز سے حج تک دین کے ہر بنیادی رکن کو ہم نے بے حیثیت کر دیا ہے۔ نماز خدا کی یاد کا نام تھا۔ ہم نے اسے بے روح اٹھک بیٹھک میں بدل دیا ہے۔ حج شیطان کے خلاف جنگ تھی ہم نے سے سیر و سیاحت اور نئے گناہوں سے قبل ماضی کے گناہ معاف کرانے کا ٹوٹکا سمجھ لیا ہے۔ باقی جو اعمال صالح بندوں سے متعلق ہیں اور تعداد میں کہیں زیادہ ہیں، وہ ہمارے ہاں ویسے بھی زیر بحث نہیں آتے۔ ہمارے لیے یہی بہت ہے کہ ہماری ڈاڑھی اور پائنچہ شریعت کے تقاضوں کے عین مطابق ہے۔ مجال ہے کہ اس کے بعد کوئی فرشتہ ہمارے نامہ اعمال میں جھوٹ، الزام، بہتان، بدگمانی، غیبت، تجسس، تکبر، خلاف عدل بات کہنے، بلا تحقیق گفتگو کرنے، ناپ تول میں کمی، خیانت و بد دیانتی، اسراف و حق تلفی، ریا کاری اور بخل، انانیت اور تعصب کا کوئی جرم درج کر سکے۔

حقیقت یہ ہے کہ ہم سب کی ایک ذاتی قراردادِ مقاصد ہے، مگر اِس کا اسلام کی اصل تعلیم سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ قراردادِ مقاصد ہمارے فرقے، گروہ، نظریات، تعصّبات، خواہشات اور ہمارے مفادات کی نمائندگی کرتی ہے۔ ہم اسی کے مطابق جیتے اور اسی کے سانچے میں معاشرے کو ڈھالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ سماج میں جو تبدیلی آرہی ہے وہ اسی ذاتی قراردادِ مقاصد پر مبنی ہے۔ اسی کا ایک عکس ہماری اجتماعی زندگی میں شب و روز نظر آتا ہے۔ اسی پر مبنی اسلام اس ملک میں ہر جگہ ملتا ہے اور اسی کے مطابق ڈھلنے والے مسلمان یہاں ہر جگہ آباد ہیں۔

چنانچہ آج اس ملک کی جو حالت ہے اور جس طرح کا اسلام ہم کو وطن عزیز میں ہر جگہ نظر آتا ہے، اس کے پیچھے ہم سب کی وہی قرارداد مقاصد ہے جو ذاتی زندگی میں ہم نے اپنا رکھی ہے۔ جس روز ہم قرآن مجید کی دی ہوئی قرارداد مقاصد کو اپنی زندگی بنالیں گے، اس روز یہ ملک بدل جائے گا۔ چاہے آئین میں کوئی قرارداد مقاصد لکھی ہو یا نہ لکھی ہو۔

قراردادمقاصد اورریاست پاکستان

کچھ عرصے قبل اس خاکسار نے قراردادِمقاصد کے حوالے سے ایک مضمون لکھ کر یہ واضح کرنے کی کوشش کی تھی کہ ہم میں سے ہر شخص کی ایک ذاتی نوعیت کی قراردادِمقاصد ہے جو قرآن وسنت کے معیارات کے بجائے اپنے تعصّبات، خواہشات اور مفادات کی عکاسی کرتی ہے۔ جب تک یہ دوعملی دور نہیں ہوتی آئینی سطح پر کوئی قراردادِمقاصد کسی پہلو سے مفید نہیں ہوسکتی۔ اس پر ایک سوال یہ ہوا کہ مجھے آئینی سطح پر قراردادِمقاصد کے بارے میں اپنا موقف صاف الفاظ میں واضح کرنا چاہیے۔ پیش نظر مضمون میں اسی حوالے سے کچھ گزارشات مقصود ہیں۔

زمانہ قدیم میں عام طور پر ریاست کا ایک مذہب ہوا کرتا تھا۔ جیسے مشرکانہ ریاست، مسیحی ریاست یا خود مسلمانوں کی اسلامی ریاست۔ تاہم دور جدید میں مغربی تہذیب نے دنیا کو جہاں سائنسی طور پر بہت کچھ دیا وہیں سماج کو بھی کئی پہلوؤں سے بدل کر رکھ دیا۔ اسی ضمن کی ایک تبدیلی یہ تھی کہ اب ریاست مذہب سے غیر متعلق ہوگئی اور مذہب فرد کا ذاتی معاملہ بن کر رہ گیا۔

اس تبدیل شدہ صورتحال میں اگر پاکستان کی پارلیمان کسی قرارداد کے ذریعے سے اس عزم کا اظہار کرتی ہے کہ پاکستان جس کے عوام کی غالب ترین اکثریت مسلمان ہے، اس میں اجتماعی سطح پر بھی اسلام کے احکام کو نافذ کیا جائے گا اور اس پہلو سے ہماری ریاست دوسری ریاستوں سے مختلف ہوگی تو میرے نزدیک یہ کوئی قابل اعتراض بات نہیں ہے۔ اپنی اجتماعی پوزیشن کی وضاحت کی حد تک ایسی کسی قرارداد مقاصد میں کوئی حرج نہیں۔ مگر خیال رہے کہ نہ ایسی کوئی قرارداد دین کا مطالبہ ہے اور نہ اس کے خلاف کرنا دین کے کسی حکم کی خلاف ورزی ہے۔ یہ نئی دنیا کی تبدیل شدہ صورتحال میں اپنے ایک امتیازی وصف کو واضح کرنے کا عمل ہے۔

دین ریاست سے کسی قرارداد مقاصد کا مطالبہ نہیں کرتا۔ وہ سماج کو اجتماعی اور ریاستی سطح پر کچھ

احکام کی پابندی کا مکلّف بناتا ہے اور بس۔ دور قدیم میں مسلم ریاستیں اسی اصول پر کام کر رہی تھیں۔ اس کا طریقہ یہ تھا کہ قاضیوں کا ایک نظام تھا جو اپنی فقہی ترجیحات کے مطابق انفرادی اور اجتماعی امور میں فیصلے کیا کرتے تھے۔ دور جدید میں سعودی عرب میں ملوکیت اور ایران میں تھیا کریسی کے زیر سایہ کم و بیش اسی ماڈل کو اختیار کیا گیا ہے۔ پاکستان میں چونکہ جمہوری نظام تھا اس لیے یہاں صورتحال مختلف تھی۔ چنانچہ علماء نے پہلے پارلیمنٹ پر اثر انداز ہو کر قرارداد مقاصد کی راہ ہموار کی اور اس کے بعد دستوری سطح پر قدیم فقہی تعبیرات کو اسلام کے نام پر نافذ کرنے کی جدوجہد شروع کر دی۔ یہیں سے ایک سنگین مسئلہ پیدا ہو گیا۔ وہ مسئلہ کیا ہے، اسے ایک آسان مثال سے ہم سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔

ہماری قدیم فقہی تصورات میں احادیث مبارکہ کی بنیاد پر ایک نقطہ نظر یہ قائم کیا گیا کہ تصویر کھنچوانا حرام ہے۔ دوسری طرف جدید تمدن خاص کر انفارمیشن ایج تو کھڑا ہی تصویر کی بنیاد پر ہے۔ ایسے میں کم و بیش تمام اہل مذہب کے ساتھ یہ سانحہ پیش آیا کہ قدیم فقہی تصور کے مطابق وہ تصویر کو حرام تو سمجھتے ہیں، لیکن عملاً سب شوق سے تصویر کھنچواتے ہیں۔ جو گنتی کے چند لوگ اسے حرام سمجھ کر عملاً اجتناب کرتے ہیں وہ ملکی اور بین الاقوامی قانون کی بنا پر اپنی اور اپنی مستورات کی تصاویر شناختی کارڈ اور پاسپورٹ کے لیے تو کھنچوا ہی لیتے ہیں۔

یہ ایک معاملہ جو تصویر کا ہے اجتماعی سطح پر ان گنت چیزوں کا اور ہے۔ وہاں لوگ قدیم کلاسیکل چیزوں کے نفاذ پر اصرار کرتے ہیں جن میں سے بہت سی دور حاضر میں قابل قبول نہیں۔ مثلاً یہ کہ حدود میں کسی خاتون کی گواہی سرے سے مانی ہی نہیں جاتی۔ ایسے میں یہ ضروری تھا کہ تصویر میں جو اجتہاد دنیا بھر کے مسلمان کر چکے ہیں، وہی اجتہاد دیگر معاملات میں کیا جاتا۔ بلکہ اس سے آگے بڑھ کر فہم دین کے اصولوں پر از سر نو غور کرنے کی بھی ضرورت تھی۔

مگر یہ کرنے کے بجائے اہل دین نے حکمرانوں اور ان جدید تعلیم یافتہ طبقات کو سیکولر اور لادین قرار دے کران کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ حالانکہ معاملہ یہ نہیں تھا کہ ان میں سے سب لوگ اسلام کی اجتماعی تعلیمات کے خلاف تھے۔ ان کا اصل اعتراض زرعی دور میں تشکیل پانے والے کچھ فقہی معاملات پر تھا۔ تصویر کی مثال ہم نے اسی پس منظر میں دی ہے کہ اس کی روشنی میں جدید ذہن کے اشکالات کو سمجھنا اہل مذہب کے لیے بھی آسان ہے۔ مگر جب کبھی کسی محقق نے اس مسئلے کے حل کی کوشش کی تو سب لٹھ لے کر اس کے پیچھے پڑ گئے۔ منکر حدیث سے لے کر سیکولر تک کی ہر ممکنہ مذہبی گالی کو استعمال کر کے اسے بدنام کیا گیا۔ حالانکہ تصویر کی مثال دے کر ہم نے یہ واضح کیا ہے کہ جب اپنی ضرورت اور خواہش ہو تو کوئی حدیث کو نہیں دیکھتا۔ کوئی کسی کمزور تاویل سے راستہ ڈھونڈ تا ہے اور کوئی دوسرا یہ زحمت بھی گوارا نہیں کرتا۔ ایسا کرتے ہوئے ہم نہ منکر حدیث ہوتے ہیں نہ سیکولر بنتے ہیں۔ یہ ہماری اخلاقی حیثیت ہے۔

یہیں سے ہمارا دوسرا مسئلہ بھی سامنے آتا ہے۔ اسلام اپنے احکام ان لوگوں کو دیتا ہے جو ایمان و اخلاق یعنی عمل صالح کی زندگی کو اختیار کر کے پاکیزگی نفس کو اپنا مسئلہ بنا لیں۔ مگر ہمارا حال یہ ہے کہ عوام سے لے کر حکمرانوں اور علماء تک ہر جگہ تعصّبات، مفادات اور خواہشات کو اصل اہمیت حاصل ہو چکی ہے۔ ایسے میں قدیم دور کی فقہی تعبیرات کا تو کیا ذکر ہے، اگر اصل شریعت اسلامی کو کوئی رسول بھی آ کر نافذ کرنے کی کوشش کرے تو یہ غیر موثر ثابت ہو گی۔

یہی وہ پس منظر ہے جس میں اس خاکسار کی رائے یہ ہے کہ اس وقت کرنے کا اصل کام لوگوں کی ذاتی قرارداد مقاصد کو تبدیل کرانا ہے۔ اسے قرآن و سنت کے مطابق کرنا ہے۔ اس دوران میں اہل علم دین پر غور و فکر کا عمل جاری رکھیں اور دور جدید کی رعایت کرتے ہوئے اسلام کے آفاقی اصولوں کی آج کے معروضی حالات پر انطباق کی راہ ڈھونڈیں۔

ابو یحییٰ

لونڈیاں، ان کا ستر اور ہمارے اسلاف

ایک اخلاقی جرم کی نشان دہی

معروف عالم اور ماہنامہ الشریعہ کے مدیر محترم عمار خان ناصر نے اپنی فیس بک وال پر لونڈیوں کے ستر کے حوالے سے قدیم فقہا کی آرا نقل فرمائیں جن میں یہ بیان کیا گیا کہ لونڈیوں کا ستر گھٹنوں سے ناف تک ہے۔ نیز آثار وفقہا کی آرا کی روشنی میں یہ بھی بیان کیا گیا کہ اگر لونڈی خریدنے کا ارادہ ہو تو اسلاف کے نزدیک لونڈیوں کے ستر کے علاوہ حصے کو چھوا بھی جا سکتا ہے۔

ان تصریحات کا پس منظر اس اخلاقی رویے پر توجہ دلانا تھا جو لوگوں نے ایک عالم کی اس رائے کے سامنے آنے کے بعد اختیار کیا کہ غیر محرم سے مصافحہ جائز ہے۔ عمار صاحب کو اس رائے سے اختلاف تھا اور اس خاکسار کو بھی ہے۔ مگر انھوں نے قدیم فقہا کے اقوال نقل کر کے اسلام کے نام پر ساری اخلاقی حدود پامال کر جانے والے لوگوں کو توجہ دلائی تھی کہ کیا وہ اس بداخلاقی کا مظاہرہ اسلاف کے معاملے میں بھی کریں گے۔ یہ گویا ایک لطیف طریقے سے ایک اخلاقی جرم کی نشان دہی تھی۔

تاہم اس سے ایک دوسرا مسئلہ یہ اٹھ کھڑا ہوا کہ قدیم علم سے ناواقف جدید ذہن کے لوگ اسلاف اور صحابہ سے بدگمان ہونے لگے۔ چنانچہ اسی پس منظر میں کچھ معروضات میں نے تحریر کی تھیں جو رسالے کے قارئین کی خدمت میں پیش ہیں۔ خیال رہے کہ لونڈیوں اور غلامی کے مسئلے پر اتنے سوالات ہیں کہ بار بار مختلف پہلوؤں سے بات واضح کرنا ہوتی ہے۔ اب میں نے یہ طے کیا ہے کہ اس حوالے سے پچھلے برسوں میں جو کچھ لکھا ہے اسے ایک کتابچے کی شکل میں شایع کر دیا

جائے۔ انشاء اللہ اس سے سنجیدہ لوگوں کو ان کے سوالات کا جواب مل جائے گا۔ رہے وہ لوگ جو بات سمجھنا نہیں چاہتے ان کا کچھ بھی نہیں ہوسکتا۔ اس تمہید کے بعد میری تحریر ملاحظہ فرمائیے۔

لونڈیوں کا ستر

برادر عزیز عمار خان ناصر نے فیس بک پر اپنی پے در پے پوسٹوں سے جو بحث اٹھا دی ہے، اس کے کئی پہلو ہیں۔ ان میں سے ایک اہم پہلو لونڈیوں کا ستر اور ان کے حوالے سے بیان کردہ بعض رویوں سے متعلق ہے۔ ان چیزوں کو پڑھ کر بعض ذہنوں میں یہ سوال پیدا ہوجاتا ہے کہ کیا دین اسلام لونڈیوں کو انسان نہیں سمجھتا تھا۔ اور یہ کہ ہمارے قابل احترام اسلاف کی کتب میں اس طرح کی چیزیں کیوں ملتی ہیں جو بظاہر اخلاقی طور پر قابل اعتراض لگتی ہیں۔

اس کی وضاحت اس لیے بھی ضروری ہے کہ یہ بات صرف اسلاف کے علمی ذخیرے تک ہی محدود نہیں، بلکہ قرآن اور خاص کر احادیث پر اسی پہلو سے بعض سنگین اعتراضات کیے جاتے ہیں۔ گرچہ ہمارے جیسے طالب علم ان کی بنیاد پر مستشرقین کے اسلام، قرآن اور پیغمبر اسلام کے خلاف پروپیگنڈے سے واقف ہیں اور ان کا جواب دیتے رہتے ہیں، مگر عام لوگ ان چیزوں سے واقف نہیں۔ جب دیگر ذرائع سے ان تک ایسی چیزیں پہنچتی ہیں تو ان کا اعتماد متزلزل ہوجاتا ہے۔ نیز احادیث میں اسی نوعیت کی بعض چیزوں کو دیکھ کر انکار حدیث کا ایک ذہن پیدا ہوجاتا ہے۔

میں آغاز کلام میں اس حوالے سے اپنا ایک واقعہ بیان کرنا چاہوں گا جس کی وجہ سے بالکل ابتدائی زمانے ہی میں مجھے اس مسئلے کو گہرائی میں جا کر سمجھنے کا موقع مل گیا تھا۔ تقریباً ربع صدی قبل میں علوم اسلامی کی تعلیم کے زمانے میں اصلاحی دروس دیا کرتا تھا۔ ان دروس میں میری دعوتی سرگرمیوں کے نتیجے میں متاثر ہونے والے میرے کلاس فیلو اور جونیئر طلبا و طالبات شریک

ہوا کرتے تھے۔ یہ لوگ مجھ سے بہت عزت اور محبت کا تعلق رکھتے تھے۔ کسی موقع پر میں نے درس میں ایک حدیث بیان کردی جس میں بدکاری کی شناعت کو ذرا کھل کر بیان کیا گیا تھا۔ اس حدیث کے بیان کرنے پر درس میں موجود کچھ طالبات نے مجھ سے احتجاج کیا۔

یہیں سے میں نے پہلی دفعہ اس پر سوچنا شروع کیا کہ ایسا کیوں ہے کہ ہمارے بنیادی علمی ذخیرے میں ایسی چیزیں موجود ہیں جن کا بیان کرنا یا سننا بھی ہمارے مروجہ معیارات کے مطابق درست نہیں۔ اتفاق سے ہمارے نصاب میں سورہ قیامہ موجود تھی۔ ہر کلاس کے سارے لڑکے لڑکیاں ایک مرد استاد سے اس سورت کی آیت أَلَمْ يَكُ نُطْفَةً مِّن مَّنِيٍّ يُمْنَى (کیا انسان ایک قطرہ منی نہ تھا جو ٹپکا دی جاتی ہے) کی تشریح و تفسیر پڑھتے تھے۔ ان طالبات کو تو میں نے اس پس منظر میں بات سمجھا دی، لیکن خود اپنے اندر سوالات کی ایک دنیا پیدا ہو چکی تھی۔ چلیں وہاں تو مخلوط تعلیم پر لعنت بھیج کر اس مسئلے سے جان چھڑائی جا سکتی تھی، مگر اُس وقت تک میں عمرہ ادا کر چکا تھا۔ اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ مسجد الحرام میں سب مرد و زن موجود ہوتے اور امام صاحب قرآن کی یہی سورتیں پڑھا رہے ہوتے تھے۔

عربوں کا ثقافتی پس منظر

چنانچہ اصل مسئلہ یہ سامنے آیا کہ بات حدیث کی بھی نہیں ہے۔ قرآن کی ہے۔ اس کو تو نمازوں میں پڑھایا جاتا ہے۔ زمانہ رسالت میں تو مردوں کے پیچھے ہی خواتین کی صفیں ہوتی تھیں۔ خُلِقَ مِن مَّاءٍ دَافِقٍ (انسان کو ایک اچھلتے ہوئے پانی سے پیدا کیا گیا)، نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ فَأْتُواْ حَرْثَكُمْ أَنَّى شِئْتُمْ (تمھاری عورتیں تمھاری کھیتیاں ہیں تو جہاں سے چاہو اپنی کھیتیوں میں آؤ)، فَلَمَّا تَغَشَّاهَا حَمَلَتْ حَمْلاً خَفِيفاً (پس جب مرد نے

عورت کو ڈھانپ لیا تو اس نے ہلکا سا حمل اٹھالیا) اور ان جیسی کئی آیات قرآن ہی میں موجود ہیں۔ انھیں پڑھا بھی جاتا اور سنا بھی جاتا ہوگا۔ اچھا! ماننے والوں کو چھوڑ دیجیے منکرین کا کیا کریں گے۔ کفار مکہ کے خلاف قرآن مجید نے پوری چارج شیٹ عائد کی ہے۔ ان کی فکری، عملی اور اخلاقی کمزوریوں کو کھل کر نشانہ بنایا۔ جواب میں انھوں نے بھی کوئی کمی نہیں چھوڑی۔ مگر قرآن مجید پر یہ الزام نہیں لگایا کہ اس میں اخلاقی طور پر کوئی معیوب بات ہے۔ حالانکہ ان کے لیے یہ بہترین موقع تھا کہ قرآن اور صاحب قرآن کو بدنام کرنے کے لیے اس طرح کی آیات کو بنیاد بنا کر یہ بات اچھالیں کہ قرآن مجید کی تماثیل اور مضامین اخلاق اور ادب کے معیارات سے گرے ہوئے ہیں۔

اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ عربوں کے مزاج اور معاشرت میں اس طرح کی باتیں معیوب نہ تھیں۔ احادیث کے ذخیرے میں جو بعض واقعات، مکالمات نظر آتے ہیں، وہ بھی اسی عرب کلچر کی عکاسی کرتے ہیں۔ زمانہ جاہلیت کے عربی قصائد کو جانے دیجیے کہ شاعری اخلاقیات کی پابند نہیں ہوتی۔ مگر یہ حقیقت اپنی جگہ بہر حال موجود ہے کہ شاعری ان کے ہاں خواص تک محدود نہ تھی بلکہ پورے معاشرے کا شغل تھا۔ ہمارے معاشرے میں کتنے لوگ ہیں جو میر سے لے کر مصحفی جیسے کلاسیکل شعراء کے ہاں پائے جانے والے معاملہ بندی کے اس رنگ کو جانتے ہیں جس میں عشق کی چنگاری کے بجائے جنس کی آگ بھڑکتی ہے۔ جن کو یہ اشعار آتے ہیں وہ کسی مہذب مجلس میں ان کو نہیں پڑھ سکتے جبکہ اہل ذوق جانتے ہیں کہ امراء القیس کا معلقہ کیا تھا، اس کے بعض اشعار کی نوعیت کیا تھی اور یہ کہ وہ بطور اعزاز خانہ کعبہ میں لٹکا ہوا تھا۔ اس سے کم از کم عرب کی معاشرت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ ایک کھلا ہوا معاشرہ تھا۔

تاہم میری بات کا کوئی غلط مطلب نہ نکالیے گا۔ عربوں کے ہاں عہد جاہلی کے ادب میں جو

اخلاقی گراوٹ تھی، قرآن مجید کسی پہلو سے اس کا کوئی شائبہ بھی اپنے اندر نہیں رکھتا۔ قرآن مجید ادب عالیہ کا شاہکار ہونے کے باوجود ہر قسم کی اخلاقی گندگی سے بہت بلند ہے۔ ہاں بند معاشروں میں جو غیر فطری پابندیاں زبان و بیان پر بھی عائد ہو جاتی اور تہذیب سے گری ہوئی سمجھی جاتی ہیں، قرآن مجید ان پابندیوں کو قبول نہیں کرتا۔ بلکہ زندگی کے حقائق کو ایک فطری دائرے میں رہتے ہوئے بیان کر دیتا ہے۔ یوں یہ ہماری حدود کا تعین بھی کر دیتا ہے۔

احادیث کا ذکر میں اس وقت اس لیے نہیں کروں گا کہ وہ اس وقت اصلاً زیر بحث نہیں ہیں۔ تاہم جیسا کہ اوپر بیان ہوا، ان میں بیان کردہ بعض واقعات اور مکالمات کو بھی عرب کی اُس وقت کے کلچر کی روشنی میں دیکھنا چاہیے۔ بعض نادان اس بات کو نہیں سمجھتے۔ اپنے عجمی پس منظر میں ان روایات کو اٹھاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس طرح کی ناشائستہ چیزوں کا بیان کس طرح ان مقدس شخصیات کے حوالے سے درست ہوسکتا ہے۔ تاہم یہ اعتراض اس پس منظر سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے جسے ابھی ہم نے بیان کیا ہے۔

تین بنیادی چیزیں

عربوں کے اس ثقافتی پس منظر کو واضح کرنے کے بعد اب ہم اس مواد کی طرف آتے ہیں جس کا کچھ حصہ جب سامنے آیا تو تہلکہ مچ گیا۔ ایک رائے یہ سامنے آئی کہ اس طرح کے مواد کو سامنے آنا ہی نہیں چاہیے۔ مگر انفارمیشن ایج میں اب کچھ بھی چھپانا ممکن نہیں رہا ہے۔ ایک رائے یہ سامنے آئی کہ یہ اشاعت فاحشہ ہے۔ یہ بات بھی درست نہیں ہے۔ ہم اس کی تفصیل ابھی کیے دیتے ہیں۔

فقہا کی اس طرح کی عبارتوں سے جو توحش پیدا ہوا اس کی وجہ یہ ہے کہ آج کل کے لوگ تین چیزوں سے واقف نہیں ہیں۔ ایک وہی جس کا ذکر اوپر ہوا یعنی عرب ثقافت ہماری طرح بند

نہ تھی بلکہ وہ ایک فطری معاشرہ تھا۔اسلام کے آنے کے بعد اخلاقی گراوٹ گرچہ ختم ہوگئی مگر جو فطری آزادیاں انھیں اسلام سے قبل حاصل تھیں، وہ اسلام کے بعد بھی حاصل رہیں۔ان میں سے ایک یہ تھی کہ جنسی معاملات ان کے ہاں ایسی ناگفتنی چیز نہ تھے، جیسے ہمارے جیسے بند معاشروں میں سمجھے جاتے ہیں۔

فقہا کا طرز بیان

دوسری چیز جس سے لوگ واقف نہیں وہ ہمارے فقہا کا طرز بیان ہے۔جس پہلو سے ہمارے ہاں اسلام کو ایک **مکمل** ضابطہ حیات سمجھا جاتا ہے، یہ حیثیت اصل میں ہمارے فقہا کے کام کو حاصل ہے۔یعنی وہ زندگی کے ہر شعبے اور ہر معاملے کے ہر ممکنہ جزوی پہلو پر بھی انتہائی تفصیل اور وضاحت سے گفتگو کرتے ہیں۔پھر فقیہ چونکہ قانون دان ہوتا ہے تو وہ ہر چیز کی قانونی حدود طے کرتا ہے۔یہ قانونی حدود مروجہ اخلاقی حدود میں رہ کر بیان نہیں ہوسکتیں۔اس کے لیے تو پھر بغیر کسی ابہام کے قطعیت کے ساتھ بات بیان کرنا پڑتی ہے۔

اس حوالے سے ایک لطیفہ بھی سنتے چلیں۔کسی ملک کے قانون میں فحاشی کو قابل تعزیر جرم کی حیثیت دی گئی تو یہ بیان کرنا ناگزیر ہوگیا کہ فحاشی کیا ہوتی ہے۔جب فحاشی کی قانونی تعریف **مکمل** کر کے لکھ دی گئی تو معلوم ہوا کہ سب سے زیادہ فحش چیز وجود میں آ چکی ہے۔

بہرحال بات یہ ہے کہ قانونی معاملات کا زاویہ الگ ہوتا ہے۔چنانچہ اسی پس منظر میں مقاربت کا معاملہ ہو یا طہارت کا،جنس کا ہو یا عورتوں کا،ہمارے فقہا بال کی کھال اتارتے ہوئے آخری تفصیل بھی بیان کردیتے ہیں۔اس طرح کی بحثوں کو اخلاقی دائرے یا شائستگی کے مسلمہ پیمانے پر نہیں ناپنا چاہیے۔یہ کام ہی غلط ہے۔نہ اس سے یہ تاثر لینا چاہیے کہ ہر ہر شخص ہر موقع پر یہی کام کررہا ہوتا تھا جو فقہا بیان کرتے ہیں۔مثلاً فقہا بیان کرتے ہیں کہ آزاد عورت کا

ستر آزاد عورت کے لیے وہی ہے جو لونڈی کا نامحرم کے لیے ہے۔ یعنی ناف سے گھٹنوں تک۔ مگر کیا ساری خواتین ہر وقت دیگر خواتین کے سامنے اسی حلیے میں گھومتی رہتی تھیں۔ ظاہر ہے کہ یہ نہ پہلے کبھی ہوا نہ اب کبھی ہوسکتا ہے۔ یہ بیان قانون ہوتا ہے بیان واقعہ نہیں۔

اسی کے ذیل میں دو اور باتیں بھی سمجھ لینا چاہییں۔ ایک یہ کہ احادیث کی کتابیں بھی اصلاً فقہی کتابیں ہی ہیں۔ ان میں بیان ہونے والے احادیث کی اصل نوعیت دراصل محدثین کے اپنے نقطہ نظر کے اثبات کے لیے بیان کیے ہوئے دلائل کی تھی۔ یعنی کسی مسئلے کے بارے میں اپنا نقطہ نظر ثابت کرنے کے لیے آثار و روایات کو پیش کیا جاتا تھا۔ دوسری یہ کہ محدثین ہوں یا فقہا ان کا کام علمی نوعیت کا ہے۔ انھوں نے زندگی کے علم کو مدون کیا ہے۔ نابالغ بچوں کے لیے کورس کی کتابیں نہیں لکھیں کہ ان کی اس نوعیت کی چیزوں پر اعتراض کیا جائے یا ان سے حسن ظن ختم کر دیا جائے۔

غلامی کی وسعت اور نوعیت

تیسری اور سب سے اہم بات غلامی کے ادارے کو سمجھنا ہے۔ آج کل کے لوگ اس کا کوئی معمولی سا اندازہ بھی نہیں کر سکتے کہ زمانہ قدیم میں غلامی کا ادارہ کتنا ہمہ گیر اور معاشرتی زندگی کا کیسا ناگزیر حصہ تھا۔ میں اس کو سمجھانے کے لیے ہمیشہ موجودہ دور کی سروس انڈسٹری سے دیتا ہوں۔ جیسے آج کل کی ملازمت معاشرت کا ناگزیر حصہ ہے جس کے بغیر کوئی گھر اور دفتر، دکان اور منڈی نہیں چل سکتی، اسی طرح زمانہ قدیم کے زرعی دور میں زندگی غلامی پر منحصر تھی۔

ہم جو ملازمت کرتے ہیں وہ آٹھ گھنٹے کی ایک محدود غلامی ہی ہوتی ہے۔ ہماری نفسیات نے اس کو قبول کرلیا ہے۔ زمانہ قدیم میں غلامی کو انسانی معاشروں نے ایسے ہی قبول کرلیا تھا۔ لونڈی غلام وہاں انسان نہیں بلکہ چیزیں سمجھے جاتے تھے۔ لونڈیاں اس ادارے کا آدھا حصہ تھیں

جن کا غلاموں کی بنسبت دہرا کردار تھا۔ ایک طرف وہ ملازماؤں اور خادماؤں کا کردار ادا کرتی تھیں تو دوسری طرف وہ مردوں کی جنسی تسکین کا ایک ذریعہ بھی تھیں۔

غلامی مسلمانوں کی ایجاد نہیں تھی۔ زرعی دور میں یہ پوری دنیا کا معاملہ تھا۔ مسلمان اسی دنیا کا حصہ تھے۔ قرآن مجید نے اس صورتحال کو ختم کرنے کے لیے ایک پورا طریقہ کار وضع کیا تھا۔ یہ مقصد کیوں پورے طور پر حاصل نہیں ہوسکا، اس پر میں نے پچھلے برسوں میں متعدد تفصیلی مضامین لکھ کر یہ بتایا ہے کہ مسئلہ کیا ہو گیا تھا۔ ان میں سے ایک تفصیلی مضمون میری کتاب ملاقات میں میں ''اسلام ور لونڈیاں'' کے عنوان سے موجود ہے۔ دلچسپی رکھنے والے قارئین اسے پڑھ سکتے ہیں۔ سردست بہت اختصار سے عرض ہے کہ قرآن مجید کی تعلیمات کی روشنی میں خلفائے راشدین نے غلامی کے خاتمے کا وہ تدریجی عمل جاری رکھا جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے شروع کیا تھا۔ مگر اُس دور کی فتوحات کے نتیجے میں لاکھوں نئے غلام اسلامی معاشرے میں داخل ہو گئے۔ اس کے بعد جلد ہی خلافت راشدہ ختم ہوگئی اور مسلم معاشرہ آمریت کی غلامی میں چلا گیا۔ یوں ساری اصلاحات کا پہیہ پہلے رکا اور پھر الٹ گیا۔ جب پوری قوم ہی آمریت کی اسیر ہوگئی تو اس کے بعد کس کو فکر ہوتی کہ انفرادی غلامی ختم ہونی چاہیے۔ یوں دنیا کی نئی سپر پاور یعنی مسلمانوں کے مراکز جلد ہی دنیا بھر سے آنے والے لونڈی غلاموں کی منڈیاں بن گئے۔

لونڈی ایک تجارتی مال تھا جو بازار میں بک رہا تھا۔ مال کو تو مال کے اصول پر خریدا جاتا ہے۔ دیکھا بھالا بھی جاتا ہے۔ فقہا کے سامنے ایک تجارتی مسئلہ آیا۔ انھوں نے اپنے قانونی طریقے پر بالکل قانونی جواب دے دیا۔ اگر معاشرے نے غلامی کو قبول کر رکھا ہے، بازاروں میں دنیا بھر کے لونڈی غلام مہنگے داموں فروخت ہونے کے لیے لائے جارہے ہیں، امراء کے حرم بھرے جارہے ہیں، عوام کی ضروریات بھی انھی پر موقوف ہیں، لونڈیاں ہر گھر میں موجود ہیں، سارے

کام کاج وہی کرتی ہیں تو بے چارے فقہا کیا کریں۔ وعظ کریں کہ لونڈیوں کو دیکھ کر نگاہیں نیچی کر لی جائیں؟

باقی جہاں تک یہ سوال ہے کہ لونڈیوں کا ستر عام خواتین کے ستر سے مختلف کیوں سمجھا گیا تو اس میں ایک پہلو وہی ہے جو پیچھے بیان ہوا کہ ناف سے گھٹنے تک کے ستر کا مطلب یہ نہیں تھا کہ لونڈیاں ہمیشہ اپنی قمیض اتار کر گھومتی تھیں۔ دوسرا یہ کہ لونڈیاں سروس انڈسٹری کا حصہ تھیں جنھیں وہ سارے کام کاج کرنا ہوتے تھے جن کے ساتھ وہ پابندیاں عائد کرنا جو عام مسلمان خواتین پر لگائی گئی تھیں، عملاً ممکن نہ تھیں۔ وہ اُس زمانے میں گھروں میں کیا جانے والا کام کاج کرتیں یا محرم نامحرم کا خیال کر کے چادر سے سر اور جسم ڈھانکتی پھرتیں۔ چنانچہ فقہا نے ان کے حوالے سے جو قانون سازی کی وہ عرف و عادت پر مبنی تھی۔ اصل خرابی فقہا کی عبارتوں میں نہیں لونڈی غلاموں کے اس نظام میں تھی جو ایک عالمگیر برائی کے طور پر زمانہ قدیم میں موجود تھا۔

ایک طالبعلمانہ مشاہدہ

تاہم اس حوالے سے میرا اپنا ایک مشاہدہ ہے جو میں دین کے سنجیدہ طالب علموں کے سامنے رکھنا چاہ رہا ہوں۔ ہمارے ہاں ایک الزام اکثر و بیشتر دہرایا جاتا ہے کہ فلاں عالم مغرب سے متاثر ہے اور مغربی تصورات کو اسلام کے نام پر دین میں شامل کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ کیا کبھی کسی نے ابتدائی صدیوں میں تشکیل پانے والے فقہی ڈھانچے کا بھی اس پہلو سے جائزہ لیا ہے کہ اس نے کس حد تک اس دور کے عالمی تصورات کا اثر قبول کیا تھا۔ اسی غلامی اور لونڈیوں کے ستر کو لے لیجیے۔ کیا ہماری فقہ میں اس کا ماخذ قرآن و سنت ہیں یا پھر اُس دور کے رائج تصورات؟ میں اس طرح کی درجنوں مثالیں دے سکتا ہوں۔ جو لوگ دیانت داری کے ساتھ علم و تحقیق کا ذوق رکھتے ہیں وہ اس پر غور کریں گے تو بہت سی چیزیں واضح ہوں گی۔

میں نے اپنے علمی ذوق کو ایک کونے میں رکھ کر اپنے لیے ایک دوسرا میدان منتخب کر رکھا ہے۔ یہ ایمان واخلاق اور دعوت کا میدان ہے۔ اسی کا تقاضہ ہے کہ اس مضمون کے آخر میں وہ اصل مسئلہ بیان کردوں جہاں سے عمار صاحب نے یہ پوری بحث اٹھائی تھی۔ لوگوں نے ایک عالم سے اختلاف کرتے ہوئے اخلاق کی ہر سرحد کو پار کرلیا تھا۔ بلا مبالغہ بات گھر کی خواتین تک پہنچ گئی تھی۔ لوگ جب اس حد پر چلے گئے تو اللہ کی مشیت کا یہ تقاضہ ہوا کہ لوگوں کے قدموں سے اخلاقی جواز کی وہ زمین کھینچ لیں جس پر کھڑے ہو کر وہ خود ساری اخلاقی حدود پار کررہے تھے۔ اس کے بعد بھی لوگ باز نہیں آئے تو بڑے دن کی حاضری کے وقت فیصلہ ہو جائے گا۔

ہلاکت ہے ڈنڈی مارنے والوں کے لیے، یہ جو دوسروں سے لیتے ہیں تو پورا لیتے ہیں اور جب ان کے لیے ناپتے یا تولتے ہیں تو اِس میں ڈنڈی مارتے ہیں۔ کیا یہ نہیں سمجھتے کہ یہ اٹھائے جائیں گے؟ ایک بڑے دن (کی حاضری) کے لیے۔ اس دن جب لوگ پروردگار عالم کے حضور پیشی کے لیے اٹھیں گے، (المطففین 84:6-1)

ایمان، انداز فکر اور صحابہ کرام

لونڈیوں کے حوالے سے سے لکھے گئے مضمون میں اس عاجز نے یہ واضح کر دیا تھا کہ برادر عزیز عمار خان ناصر نے جو بحث اٹھائی ہے اس کے بہت سے پہلو ہیں۔ بہتر یہی ہوتا ہے کہ اس طرح کے نازک مباحث میں انھی پہلوؤں پر قلم اٹھایا جائے جہاں لوگ سوال اٹھادیں۔ ہم جان بوجھ کر بعض آثار کو زیر بحث نہیں لائے تھے جن میں صحابہ کرام کا ذکر کیا گیا تھا۔ مگر اب احباب نے لونڈیوں کے ساتھ بیان کیے جانے والے رویے کو بار بار اٹھایا ہے تو اب اس پر بات ہوگی۔

زیر بحث آثار میں حضرت عمر کے حوالے سے یہ بیان ہوا ہے کہ وہ لونڈیوں کو سر ڈھانکنے سے

روکتے تھے بلکہ اس میں سختی کرتے تھے جبکہ حضرت علی اور حضرت ابن عمر کے حوالے سے بیان ہوا ہے کہ لونڈیاں خریدتے وقت جسمانی جانچ کے قائل تھے۔

ایک طریقہ یہ ہے کہ ان آثار میں صحابہ کرام کے رویے کی وضاحت کی جائے۔ یہ بھی کیا جاسکتا ہے۔مگر یہاں پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے اور یہی سوال اس مضمون کے لکھنے کا سبب ہے۔ہم سب اپنے اپنے اندازِ فکر کی عدالت لگا کر دوسروں کو جواب دہی کے کٹہرے میں کھڑے کرنے کے کیوں عادی ہو چکے ہیں۔ممانعت اس بات کی نہیں ہے کہ سوال کیا جائے۔روکا اس بات سے بھی نہیں جا رہا کہ اعتراض کیا جائے۔کسی بات کو سمجھنے کی کوشش کرنا تو ویسے ہی اچھی عادت ہے۔

مگر اصل مسئلہ ہمارے اندازِ فکر کا ہے۔یہ اندازِ فکر یہیں پر نہیں رکتا۔یہ آگے بڑھتا ہے۔ایک دوسرا شخص اٹھے گا اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہستی اور آپ کے بعض اعمال کے حوالے سے چیزیں نکال لے گا۔بات یہیں تک نہیں رکے گی خود رب کائنات کی ہستی کو لوگ اسی اصول پر نشانہ بناتے ہیں۔ ہماری زندگی انھی سوالوں کے جواب دیتے ہوئے گزر گئی ہے۔ ہم ابھی بھی اس خدمت کو سر انجام دینے کے لیے تیار ہیں۔

مگر حضور یہ مسئلہ یہیں تک نہیں رکتا۔ یہ آپ کے گھر تک پہنچتا ہے۔آپ کے حلقہ احباب تک پہنچتا ہے۔آپ کی بیوی بچوں تک پہنچتا ہے۔ ہر شخص آپ کے احتساب کی زد میں آجاتا ہے۔آپ اگر مذہبی پس منظر رکھتے ہیں تو آپ جلیل القدر علمائے دین اور محققین کو بھی اپنے ناقص علم کی عدالت کے کٹہرے میں لا کھڑا کرتے ہیں۔ساری فرقہ واریت، تعصب اور ہٹ دھرمی اور ذاتی زندگی اور تعلقات میں بیشتر خرابیاں اسی سے پیدا ہوتی ہیں۔چلیں اس کو تو پھر جانے دیں کہ کٹہرے میں آپ ہمیشہ دوسروں کو ہی لاتے ہیں، مگر رکیے! اور سنیے! اس اندازِ فکر کے بعد آپ اللہ کے حضور رعایت کا ہر استحقاق کھو چکے ہیں۔

روز قیامت اللہ تعالیٰ آپ کو اپنے احتساب کے کٹہرے میں کھڑا کردیں گے۔آپ کے زمانے، حالات، ماحول، پس منظر کی کوئی رعایت نہیں دی جائے گی۔آپ کی ہر کمزوری کو جرم سمجھا جائے گا۔ ہر خطا کی پرسش ہوگی۔اور ہر گناہ قابل گرفت ٹھہرے گا۔ اس لیے یہ طے کیجیے کہ آپ سوال کرکے بات سمجھنا چاہتے ہیں یا دوسروں کو کٹہرے میں کھڑا کرنے کا شوق ہے۔ہمیں آپ کے اختلاف رائے کے حق کا کوئی انکار نہیں۔ہم اللہ اور رسول کے دفاع کے علاوہ باقی کسی کے دفاع کو دین کا حصہ نہیں سمجھتے۔لیکن یہ توقع رکھنے میں حق بجانب ہیں کہ جتنا حسن ظن ہمیں اپنے آپ سے ہے، اتنا دوسروں سے بھی رکھنا چاہیے۔دوسروں کے رویے کی ہمیشہ بہتر تاویل کرنا چاہیے۔ بس دو باتیں یاد رکھنا چاہییں۔ ہمارا دین اصل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام ہے۔ اس کے علاوہ ہر شخص انتہائی محترم ہوسکتا ہے، دین نہیں بن سکتا نہ اس کے کسی معاملے سے دین پر ہمارا اعتماد مجروح ہونا چاہیے۔دوسرے یہ کہ ہم سب انسان ہیں۔ یہ صرف ہمارا رب ہے جو ہر عیب اور خطا سے پاک ہے۔

اب آیئے اصل سوال کی طرف۔اس سوال کا جواب بہت اختصار سے پچھلے مضمون میں دیا جاچکا ہے۔اس کی تفصیل بار بار ہم اپنے مختلف مضامین میں کرچکے ہیں۔اصل مسئلہ یہ ہے کہ آج کے دور کے لوگ آزادی کے دور میں پیدا ہونے والے شہری لوگ ہیں۔غلامی تو دور کی بات ہے یہ تو دیہاتوں کے فیوڈل لارڈ کے ہاں مزارعوں کی حیثیت سے بھی واقف نہیں ہیں۔اگر آپ غلامی کے پھیلاؤ اور لونڈی غلاموں کی اُس دور میں حیثیت سے واقف نہیں ہیں تو آپ اس مسئلے کو سمجھ ہی نہیں سکتے۔

اسے سمجھانے کے لیے ہم ایک دوسری مثال پیش کرتے ہیں۔سود کی شناعت اور قرآن و حدیث میں اس پر آنے والی وعیدوں سے ہم سب واقف ہیں۔دوسری طرف دور جدید میں سود کا پھیلاؤ کتنا بڑھ گیا ہے۔مگر ابھی یہ اس کا آغاز ہے۔دنیا بھر کی حکومتوں کا پروگرام ہے کہ ہے اگلے

چند برسوں میں سوائے بینک کے کوئی خرید وفروخت نہیں ہو سکے گی۔ آپ بینک کو بیچ میں لائے بغیر کچھ خرید سکیں گے نہ بیچ سکیں گے۔ نہ ملازمت ہوگی، نہ کاروبار ہوگا نہ دکان چلے گی۔ نہ گھر ہوگا نہ شاپنگ۔ یہ کسی ایک ملک کا معاملہ نہیں بلکہ پوری دنیا کا نظام اسی اصول پر منسلک ہو جائے گا۔ ایسے میں پہلی دفعہ کہیں مغربی معاشرے میں اسلام پھیلنے لگتا ہے تو بتایئے کہ کیا ہوگا۔ کیا ہوگا کو چھوڑیے ہم بتاتے ہیں ابھی کیا ہو رہا ہے۔

اس وقت جب کہ ہم ایک مذہبی ملک میں موجود ہیں عام لوگوں کو تو چھوڑیں ہر مذہبی آدمی، ہر مذہبی تنظیم کا بینک اکاؤنٹ موجود ہے۔ ہر بڑی ٹرانزیکشن بینک سے ہوتی ہے۔ بینکنگ سسٹم کی ساری طاقت اسی اکاؤنٹ اور ٹرانزیکشن میں ہوتی ہے۔ اس پہلو سے بینک اکاؤنٹ کھلوانا سب سے بڑا جرم ہے۔ تو کیا ہم اس اصول پر اپنے نیک لوگوں کا احتساب شروع کردیں۔ زیادہ سے زیادہ ہم ان لوگوں پر اعتراض کر سکتے ہیں جو دن رات سود کے خلاف کالم لکھتے اور مہمیں چلاتے ہیں اور پھر بھی بینکنگ سسٹم سے ہر پہلو سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ باقی لوگوں کو اس برائی کے پھیل جانے کی بنا پر بہرحال رعایت ملے گی اور ان کے تقویٰ کا پیمانہ یہ نہیں بن سکتا کہ انھوں نے بینک میں اکاؤنٹ کھلوا رکھا ہے یا بینک ٹرانزیکشن کرتے ہیں۔

چنانچہ جب آپ بینک اکاؤنٹ کھلوائیں گے تو اپنی پسند اور سہولت دیکھیں گے۔ یہ بھی دیکھیں گے کہ کس کا لاکر محفوظ ہے اور کس کی سروس اچھی ہے۔ اس روشنی میں صحابہ کے لونڈیوں کے بارے میں طرزِ عمل کو دیکھیے۔ امید ہے کہ ان کے طرزِ عمل میں آپ کچھ حسنِ ظن کا مظاہرہ کریں گے۔ اگر پھر بھی اطمینان نہ ہو تو پہلے اپنا بینک اکاؤنٹ بند کروائیں۔ آئندہ کسی حال میں اکاؤنٹ یا لاکر نہ کھولنے کا عزم کریں اور پھر ہم سے آ کر سوال کریں کہ وہ لونڈیوں کو خریدنے سے قبل ان کا جائزہ لینے کو کیوں روا سمجھتے تھے۔ بندہ انشاءاللہ اُس وقت اس سوال کا جواب ضرور عرض کرے گا۔

مکاتیب

ابویحییٰ

شہرت اور خاموشی

عزیز بہن قرۃ العین طاہرہ 9 اپریل 2016

السلام علیکم ورحمت اللہ وبرکاتہ

میری کتابوں پر آپ کے فیڈ بیک کا بے حد شکریہ۔ اللہ آپ پر اپنا فضل و کرم فرمائیں اور دین و دنیا کی بھلائیوں سے نوازیں۔

آپ نے جن جذبات واحسات کا اظہار فرمایا اور جو ارشادات اپنے خط میں لکھے میں دل سے ان کی قدر کرتا ہوں۔

تاہم جو کچھ میں نے اپنی کتاب آخری جنگ میں چہرے کے پردے کے اختلافی ہونے کے حوالے سے لکھا ہے اس کا ایک پس منظر ہے۔ پس منظر یہ ہے کہ ہمارے ہاں کچھ طبقات نے دین کی اصل تعلیم کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے اور دیگر چیزوں کو جو خود مسلمانوں کے اہل علم میں مسلمہ طور پر اختلافی ہیں، ان کو عین دین بنا دیا ہے۔ ان کو ایمان، حیا اور عفت کا معیار بنا دیا ہے۔

اب ایسے میں میرے سامنے دو راستے ہیں۔ ایک یہ کہ اپنی شہرت اور مقبولیت کی خاطر میں ان سارے معاملات میں خاموش رہوں۔ لوگوں کی پسند کی باتیں کروں۔ داد سمیٹوں۔ واہ واہ سنوں اور خوش رہوں۔ میری بہن میں یہ ضرور کرتا اگر میں صرف ایک ناول نگار ہوتا۔ اگر مجھے مرنا نہ ہوتا۔ اگر مجھے اللہ کے حضور پیش نہ ہونا ہوتا۔ مگر کیا کروں۔ مرنا بھی ہے اور رب کے حضور جواب بھی دینا ہے۔

اگر اس نے پوچھ لیا کہ جس وقت یہ جاہل اور انتہا پسند میرے دین کے ساتھ کھلواڑ کر رہے تھے، اس میں غلو کر رہے تھے، تم نے اپنے فائدے کی خاطر خاموشی اختیار کی۔ جس سچ کو جانتے تھے۔ اس کو نہیں بیان کیا۔ مجھے بتا دیجیے کہ میں اللہ کو کیا جواب دوں گا۔

پھر یہ بھی دیکھیے کہ میں نے اپنی کتاب آخری جنگ میں کہیں خواتین کو یہ تلقین نہیں کی کہ وہ چہرے کا پردہ نہ کریں۔ صرف یہ بتایا ہے کہ اس معاملے میں دو نقطہ نظر ہیں اور یہ کہا ہے کہ جس کے دلائل پر دل مطمئن ہو اس کی رائے پر عمل کرلیں۔

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ خواتین کے چہرے کا پردہ ہے یا نہیں ایک مسلمہ اختلافی مسئلہ ہے۔ جو اس کے قائل نہیں وہ قرآن وحدیث ہی سے اس کے دلائل دیتے ہیں۔ ہندو پاک اور سعودی عرب سے باہر پورے عالم اسلام میں آپ کو بیشتر مذہبی خواتین چہرے کے پردے کے بغیر ملیں گی۔ حج کے موقع پر حالت احرام میں تو نقاب کی خود صحیح حدیث میں ممانعت ہے۔ (بخاری، رقم 1838)۔ اسلاف میں سے امام ابوحنیفہ سے لے کر معاصرین میں امام البانی جیسے مسلمہ اہل علم کے نزدیک یہ کوئی دینی مطالبہ نہیں۔ ایسے میں کچھ لوگ اس کو فرض قرار دیں۔ خواتین کے دین و ایمان کو اس پر موقوف قرار دیں۔ جو اختلاف کرے اسے مغرب کا ایجنٹ اور مغربیت کے فروغ کا سبب گردانیں، ایسے میں اس غلو فی الدین کے خلاف خاموش رہنا میرے نزدیک کتمان حق ہے۔ اس جرم کی سزا اللہ کے نزدیک جہنم کی آگ ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

بے شک جو لوگ اس چیز کو چھپاتے ہیں جو اللہ نے اپنی کتاب میں اتاری ہے اور اس کے عوض حقیر قیمت قبول کرتے ہیں۔ یہ لوگ اپنے پیٹ میں دوزخ کی آگ بھر رہے ہیں۔ اللہ ان لوگوں سے قیامت کے دن نہ تو بات کرے گا نہ ان کو پاک کرے گا۔ ان کے لیے دردناک

عذاب ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں جنھوں نے گمراہی کو ہدایت اور عذاب کو مغفرت پر ترجیح دی۔ کیسے جری ہیں یہ لوگ دوزخ کے معاملے میں ۔‘‘(البقرہ 2:175-174)

میرے نزدیک اس اختلاف کو چھپانا اور اس کو ایک مسلمہ اور متفقہ دینی حکم کے طور پر پیش کرنا ایک بدترین جرم ہے۔ اس کا ارتکاب کرنا اور اس پر خاموش رہنا دونوں وہ جرائم ہیں جن کی سزا جہنم کی آگ ہے۔

اب یہ فرمایئے کہ میں خود کو کچھ انتہا پسندوں کی نظروں میں آپ کے الفاظ میں متنازع ہونے کو اہمیت دوں یا اس آگ کو جو انسان کی چمڑی ادھیڑ دے گی۔ یہ فیصلہ میں آپ پر چھوڑ رہا ہوں۔ بس یہ یاد رکھیے گا کہ قیامت کے دن ہر شخص کو گواہی کے لیے بلایا جائے گا۔ خدا کے دین کو بدنام کرنے والے ان انتہا پسندوں کو بھی بلا کر پوچھا جائے گا کہ تمھاری یہ جرات کیسے ہوگئی تھی کہ تم اپنی رائے کو میرا حکم بنا کر پیش کر دو۔ اور خاموش رہنے والے کو بھی بلا کر بتا دیا جائے گا کہ تم نے دنیا کی حقیر پونجی کی خاطر خاموش رہنے کا جو فیصلہ کیا تھا، آج وہ بہت مہنگا پڑے گا۔

بہرحال آپ کے حسن نیت اور اخلاص کا میں دل سے قدر دان ہوں اور آپ کے علم و عمل میں برکت کے لیے دعا گو ہوں۔

والسلام

ابو یحییٰ

روزہ جنت کا دروازہ ہے مگر یہ دروازہ صرف وہی شخص کھول سکتا ہے جو روزے کی مشقت کو تقویٰ کی کنجی میں بدل سکے

سوال وجواب

ابو یحییٰ

اللہ تعالیٰ اور وقت

سوال:

جناب ایک حدیث کے مفہوم کے مطابق اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے فرمایا ہے کہ وقت کو برا مت کہو کیونکہ میں وقت ہوں اور آپ نے اپنی کتاب ''قسم اس وقت کی'' میں ایک کردار ''وقت کا بیٹا'' ''العصر'' لکھا رتخلیق کیا ہے، براہ کرم اس پر تھوڑا غور کر کے جواب عنایت فرمادیں۔

میر آصف بلوچ

جواب:

محترم حدیث کا مفہوم آپ نے جو سمجھا ہے کہ میں وقت ہوں سے مراد معاذ اللہ یہ ہے کہ وقت اللہ تعالیٰ کے قائم مقام ہے ایک مغالطہ ہے۔ اللہ تعالیٰ زمان ومکان کی ہر چیز سے بلند ہیں۔ وقت مخلوقات میں سے ایک مخلوق ہے اور بس۔ ہمارا رب پاک ہے کہ اس جیسا کوئی ہو۔ حدیث میں جو آیا ہے وہ ایک اعلیٰ ادبی اسلوب میں یہ بتایا جارہا ہے کہ گردش حالات سے جو کچھ ظہور پذیر ہوتا ہے وہ اللہ کی مشیت سے ہوتا ہے۔ اس کا معاذ اللہ اس بات سے کوئی تعلق نہیں کہ وقت اللہ ہے یا اللہ تعالیٰ اپنا ظہور معاذ اللہ وقت کی شکل میں کرتے ہیں۔ حدیث کا مطلب اگر واضح ہے تو پھر میری کتاب پر کوئی اعتراض باقی نہیں رہتا۔

ابو یحییٰ

قرآن کریم پڑھنے کا ثواب

سوال:

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

اللہ پاک سے دعا ہے کہ اللہ پاک مجھے سیدھے راستے کی رہنمائی فرمائے۔ جب سے میں نے قرآن پاک کا مطالعہ شروع کیا اور خالق کائنات کی نازل کردہ کتاب پر توجہ دینی شروع کی تو مجھے پتہ چلا کہ جیسا کہ قرآن میں بیان ہوا ہے، یہ واقعی انسانیت کے لیے ہدایت ہے۔ اور میرا یہ ماننا ہے کہ یہ کتاب اللہ ہے تو اسے صرف نیکیوں کے حصول کے لیے ہی نہیں پڑھنا چاہیے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم ہر کتاب، میگزین اور اخبار پڑھتے وقت اس کا سمجھنا یقینی بنائیں لیکن قرآن کی پاک کو بلا سمجھے پڑھتے جائیں؟ اور جب میں نے یہ حدیث سنی کہ الف لام میم پڑھنے سے تیس نیکیاں ملتی ہیں تو میں اور زیادہ کنفیوز ہو گیا کیوں کہ اس کے ظاہری مطلب سے تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ ہمیں قرآن پاک سمجھ کر پڑھنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اور جب میں نے سورۃ فرقان میں یہ پڑھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود امت کے خلاف کیس دائر کریں گے اور قرآن پاک کو اس پر گواہ بنائیں گے تو مجھے ذاتی طور پر یہ محسوس ہوا کہ اللہ پاک کے احکامات کی پیروی کے بغیر اور سمجھے بغیر قرآن پاک پڑھنا غلط ہے۔ برائے کرم آپ اس حدیث کی سند کے بارے میں بتا دیجیے۔ جزاک اللہ خیر۔ نجم۔ کینیڈا

جواب:

آپ نے بالکل درست فرمایا۔ قرآن مجید کو سمجھ ہی کر پڑھنا چاہیے۔ باقی جس روایت کی طرف آپ نے اشارہ فرمایا ہے وہ درج ذیل ہے۔

من قرأ حرفاً من كتاب الله فله به حسنة ، والحسنة بعشر أمثالها لا أقول (الم) حرف ولكن :ألف حرف ولام حرف ، وميم حرف .((صحیح الجامع 6469)

امام البانی نے اس کو درست قرار دیا ہے۔ تاہم میرے نزدیک حدیث کا موقع محل سمجھ لیا جائے تو کوئی اشکال نہیں رہتا۔ یہ ظاہر ہے کہ اگر یہ بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی ہے تو اس کے مخاطب صحابہ کرام ہی ہیں۔ عربی ان کی اپنی زبان ہے جس میں قرآن مجید نازل ہوا ہے۔ اب ایسے میں اگر ان سے یہ بات کہی جائے تو اس میں یہ بات خود بخود شامل ہے کہ یہ لوگ جب بھی قرآن پڑھیں گے تو لازماً سمجھ رہے ہوں گے۔ کیونکہ ان کے لیے پڑھنا اور سمجھنا بالکل ایک ہی ہے۔ مگر ہمارے لیے یہ دو الگ الگ کام ہیں۔ اس لیے ہمیں اس روایت پر اشکال محسوس ہوتا ہے ورنہ اپنے موقع محل میں یہ روایت ایک بالکل سیدھی سی بات بتا رہی ہے کہ یہاں پڑھنے میں سمجھنا ہر حال میں شامل ہے۔ امید ہے بات واضح ہوگئی ہوگی۔ ابو یحییٰ

مسئلہ نور و بشر

سوال:

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا سے نہیں گئے۔ وہ آج بھی اس دنیا میں ہیں۔ اور اس بات کو ثابت کرنے کے لیے وہ کہتے ہیں کہ جب معراج کا واقعہ پیش آیا تھا اور جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زمین سے آسمانوں کی طرف گئے تھے تو یہ کائنات اور اس کا نظام رک گیا تھا۔ اور جب واپس زمین پر آئے تھے تو سب کچھ وہیں سے شروع ہوا جہاں سے وہ چھوڑ کر گئے تھے۔ اور وہ کائنات آج بھی چل رہی ہے۔ کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حاضر ہیں اس دنیا میں۔ اور وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نور مانتے ہیں اللہ کا۔ جب کہ قرآن میں ان کے بشر ہونے کی کئی آیات ہیں۔ ان لوگوں کو کیسے قائل کیا جائے جو یہ سمجھتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زندہ ہیں اور نور ہیں؟؟؟، عائشہ آرائیں

جواب:

ایسے لوگوں کو قرآن مجید کے مطالعے کی طرف راغب کریں۔قرآن مجید خود ہی لوگوں کے تصورات کی اصلاح کر دیتا ہے۔اگر بحث کریں گی تو تلخی پیدا ہو گی۔ایسی بحثوں نے ایک زمانے میں لوگوں میں بڑی نفرتیں پیدا کی ہیں۔ان سے بچنا چاہیے۔لوگوں پر واضح کرنا چاہیے کہ ہم سے اصل مطالبہ آپ کی اطاعت اور پیروی کا ہے۔اسی پر توجہ دینی چاہیے کیونکہ یہی وہ سوال ہے جو قیامت کے دن ہم سے کیا جائے گا۔ نہ کہ آپ کے نور و بشر، حاضر و ناظر ہونے کے متعلق۔قرآن مجید ان حقائق کو آخری درجہ میں واضح کر دیتا ہے۔

سحری کے لیے اذان

سوال:

فرض نمازوں کے علاوہ تہجد کی نماز کے لیے اذان دینا ثابت ہے یا نہیں اور رمضان میں اکثر مساجد میں سحری کی اذان بھی دی جاتی تھی۔صحیح احادیث سے وضاحت کر دیں، عائشہ آرائیں۔

جواب:

اذان نماز باجماعت کے اعلان کے لیے دی جاتی ہے اور اسی حیثیت میں اذان دینا مسنون ہے، البتہ بخاری کی ایک روایت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ رمضان میں سحری کے آغاز پر ایک اذان دی جاتی تھی اور ایک اس کے اختتام پر۔معلوم یہی ہوتا ہے کہ پہلی اذان کا مقصد لوگوں کو سحری کے لیے اٹھانا اور دوسری سے وقت فجر اور روزے کے آغاز کا اعلان تھا۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ بے شک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بے شک رات کو بلال اذان دیتے ہیں کہ پس تم کھاؤ اور پیو یہاں تک کہ عبداللہ بن ام مکتوم اذان دیں۔

اسی پر قیاس کر کے ہمارے اہل علم بعض دیگر مواقعوں جیسے دشمن کے حملے سے خبردار کرنے وغیرہ کے لیے بھی اذان دینے کے قائل ہیں۔ابو یحییٰ

پروفیسر محمد عقیل

فارگرانٹڈ (For Granted)

زندگی میں بے شمار نعمتیں ہمیں بن مانگے مل جاتی ہیں۔ ہم ان کے لئے نہ تو سوچتے، نہ محنت کرتے، نہ پریشان ہوتے اور نہ ہی کوئی تگ و کرتے ہیں۔ اس کے باوجود یہ ہماری جھولی میں ڈال کر دے دی جاتی ہیں۔ اس میں سرفہرست اللہ تعالیٰ کی جانب سے دی ہوئی نعمتیں ہیں۔ ہم پیدا بھی نہیں ہوتے اور ماں کے پیٹ میں ہمارے رزق کا بندوبست ہو جاتا ہے۔ جب ہم اس دنیا میں آتے ہیں تو زمین کی آغوش ہمارے لئے ماں کا پیٹ بن جاتی اور زندگی گزارنے کی تمام سہولیات بن مانگے مل جاتی ہیں۔ سورج حرارت فراہم کرتا، رات سکون مہیا کرتی، چاند تارے ذوق کی تسکین کرتے، فضا تنفس کو ممکن بناتی، زمین اپنا سینہ چاک کر کے غذا کو اگلتی اور جانور گوشت کے پہاڑ بنے لذت کام و دہن کا سبب بنتے ہیں۔

ان نعمتوں کی فراہمی کو ہم فارگرانٹڈ لیتے اور اپنا حق سمجھتے رہتے ہیں۔ یہیں سے ختم نہ ہونے والی غلطیوں کا آغاز ہوتا ہے۔ پھر اس کی نعمتیں حقیر لگتیں، پھر اس کے وجود کا احساس ہی نہیں ہوتا، پھر اس کے کرم کا اندازہ نہیں ہوتا اور اس کی لا متناہی شفقت محسوس ہی نہیں ہوتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ خدا نعوذ باللہ ایک خودکار مشین کی مانند لگنے لگتا ہے۔ پھر سب کچھ خود بخود ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ آفاق میں سورج کا طلوع و غروب، سبزہ کا اگنا، غلہ کی پیداوار، زمین کی گردش، بارش کا برسنا سب کچھ خود بخود ہوتا معلوم ہوتا ہے۔ سانسوں کا زیرو بم، دل کی دھڑکن، آنکھوں کی بصارت، زبان کا تکلم، کانوں کی سماعت، دماغ کی سوچیں سب ایک خودکار نظام کے تحت بندھے ہوئے لگتے ہیں۔

پھر لاشعور میں یہ خیال راسخ ہو جاتا ہے جب سب کچھ خود بخود مل رہا ہے تو کیوں اس کی

شکرگزاری کی جائے، کیوں اس کی بندگی کی جائے، کیوں اس کی بات مانی جائے، کیوں اس کے آگے جبین نیاز ٹیکی جائے؟ اس سے اگلا قدم یہ ہوتا ہے کہ اب کسی خدا کی کیا ضرورت؟ یہ تو سب خود بخود ہو رہا ہے۔ اس سے آگے کچھ لوگ بڑھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ خدا موجود ہی نہیں اور نعوذ باللہ انسانی ذہن کی پیداوار ہے۔

اسی صورت حال سے انسان کو بچانے کے لئے اللہ تعالیٰ براہ راست مداخلت کرتے ہیں اور یہ احساس دلاتے ہیں کہ یہ سب نعمتیں انسان کا حق نہیں بلکہ اللہ کی عنایت ہیں اور اللہ جب چاہیں واپس لے سکتے ہیں۔ چنانچہ کبھی زمین کو ہلا یا جاتا، سمندر کے بند کھول دیئے جاتے، ہوا کی باگیں چھوڑ دی جاتیں، آسمانی بجلی کو آزاد کر دیا جاتا اور بارش کو طوفان میں بدل دیا جاتا ہے۔ اس کا مقصد انسان کو یہ احساس دلانا ہے کہ یہ سب کچھ فار گرانٹڈ لینے کے لئے نہیں۔ ان سب کے خالق کا شکر واجب ہے، اس کا احترام لازم، اس کی نمک حلالی ضروری ہے۔ خدا کی نعمتوں کو فار گرانٹڈ نہ لیجئے۔ ورنہ بہت جلد آپ کو یہ تجربہ کروایا جا سکتا ہے کہ یہ سب فار گرانٹڈ نہیں۔

فرح رضوان

ایندھن اور اختیار

اف خدایا! فرینڈ کی وال پر ویڈیو تھی کہ کسی بندے کو آن واحد میں فون کی بیٹری سے آگ لگ گئی اور اس حادثے سے بڑھ کر سانحہ یہ کہ لوگ آگ بجھانے کے بجائے ویڈیو بناتے رہے، جبکہ فوری طور پر میرا ذہن آئے دن خواتین کی اس بڑھتی ہوئی شکایت کی طرف چلا گیا جو وہ شدید اذیت کے ساتھ کرتی ہیں کہ للہ کوئی وظیفہ بتائیں کہ ''وہ'' انٹرنیٹ کے غلط استعمال سے باز آجائیں، اور کاش اس ویڈیو کو دیکھے کوئی جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو اور جان لے کہ ہمیں کیا برا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا کیونکہ یہ آگ تو اس آگ کے سامنے کچھ نہیں جو وہ ہر لمحہ اپنے اپنے فون میں ساتھ لیے پھرتے ہیں، ایک قرض کی صورت، جو سچی پکی توبہ کے طور پر وقت رہتے ادا نہ کیا گیا تو ہمیشہ ہمیشہ چکاتے رہنا ہوگا۔تب جلنے سے نہ تو موت واقع ہوگی نہ ہی کوئی مرہم دستیاب ہوگا......اس دوران ویڈیو بھی چلتی رہی حتی کہ فقط چند لمحات میں وہ لڑکا جل کر سیاہ ہوگیا اور اس سے آگے مجھے ہوش آ گیا کہ اس کلپ کو سٹاپ بھی کیا جاسکتا ہے۔

وہ تو ایک کلک سے بند ہو گیا لیکن ذہن میں پچھلے ہفتے کی قرآن کلاس کے سبق کے اوراق کھل گئے۔اور محض تین چار الفاظ کے معنی نے دل کو لرزا کر رکھ دیا۔

(**وقود** : ہر وہ ایندھن ہے جو شعلہ پیدا کر کے جلے ،خواہ وہ لکڑی ہو یا پتھر یا انسان ،بعض اوقات آگ کی شدت اس انتہا کو پہنچ جاتی ہے کہ اس پر پانی ڈالا جائے تو وہ بھی آگ کو بجھانے کے بجائے مزید بھڑکانے کا سبب بن جاتا ہے تو اس صورت میں پانی بھی وقود میں شامل ہو گا۔کوئی بھی ایندھن کی قسم ہو جب وہ جل رہا ہو تو اس وقت وہ وقود کہلائے گا۔)

سبحان اللہ کیا تخلیق ہے رب تعالیٰ کی کہ انسان، جو کہ ستر فیصد پانی پر مشتمل مخلوق ہے جس کی

اہم ترین ضرورت خون اور اس کی درست فراہمی اور روانی ہے، وہی خون کم وبیش ستر فی صد combustion (the act or process of burning) کی صلاحیت رکھتا ہے، یعنی انسانی جسم میں ہر دم دوڑتا ایندھن۔

ایندھن کا کام ہی جلنا ہے نصیب ہی یہی ہے اور اگر اس کا تعلق انسان سے ہے تو اسے، بس اختیار صرف اور صرف اتنا کہ یہ طے کر لے کہ خالق کی رضا کے لیے، دیے کی طرح جل کر اس کی مخلوق کے لیے روشنی کا بندوبست کرنا ہے یا قرآن وحکمت کی روشنی سے فرار اختیار کر کے دوسری طرح کا ایندھن بننا ہے؟

زندگی میں پیش آنے والے ناگوار حالات
روزے دار کے ایک سخت دن کی طرح
آخر کار گزر جاتے ہیں
یہی رمضان کا اصل سبق ہے

سخت روزے کے بعد افطار کی نعمت
دنیا کی پابند زندگی کے بعد
جنت کی پر لذت زندگی کا ایسا تعارف ہے
جو صرف روزے دار کو نصیب ہوتا ہے

ابوابراہیم

قرآن حکیم کو سمجھ کر پڑھنے کی ضرورت واہمیت اور فضیلت (1)

اللہ تعالی نے انسان پر بے شمار انعامات فرمائے ہیں اور خود اس کا اظہار فرمایا ہے کہ اگر تم اللہ کی نعمتوں کو گننا چاہو تو ان (کی گنتی) کا احاطہ نہیں کر سکتے (ابرہیم :34) انہی نعمتوں میں سے اللہ تعالیٰ کی ایک عظیم نعمت اللہ تعالیٰ کا کلام ہے یعنی قرآن مجید جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو دنیا و آخرت کی کامیابی حاصل کرنے کے لیے عنایت فرمائی لیکن افسوس اس بات کا ہے آج انسان نے خصوصاً ہم مسلمانوں نے اللہ تعالیٰ کی اس عظیم نعمت کی ناقدری کا رویہ اپنا رکھا ہے۔ جو نعمت جس قدر عظیم ہوتی ہے اس کے شکر کے تقاضے بھی اتنے ہی بڑے ہوتے ہیں اگر اس کی ناقدری کی جائے تو پھر اس کی سزا بھی اسی قدر بڑی ہوتی ہے جیسا کہ اللہ تعالی کے ارشاد کا مفہوم ہے ''اگر تم میرا شکر ادا کرو گے تو میں ضرور بالضرور تمہیں اور زیادہ عطا کروں گا اور اگر میری ناشکری کرو گے تو پھر (یاد رکھو) میرا عذاب بھی بہت سخت ہے (ابراہیم : 7) ۔ یہی وجہ ہے کہ آج اس قرآن کو چھوڑنے کی وجہ سے ہم مسلمان دنیا میں ذلیل وخوار ہیں۔ ہمیں اپنی ذلت ورسوائی کے اسباب کا بھی بخوبی علم ہے لیکن ہم ان اسباب کو دور کرنے پر آمادہ نہیں ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں مطلع فردیا تھا کہ اللہ تعالیٰ اس کتاب (قرآن کی اتباع) کے ذریعے بہت سے لوگوں کو بلندیاں عطا فرمائیں گے اور بہت سے لوگوں کو (اس سے اعراض کی وجہ سے) پست و ذلیل فرمائیں گے (مسلم)۔

قرآن مجید کو پڑھنا سمجھنا اس کی تعلیمات پر خود عمل کرنا اور اس کی تعلیمات کو دوسرے لوگوں تک پہنچانا اس قدر ضروری ہے کہ اس کے بغیر کوئی بھی انسان نہ دنیا میں صحیح معنوں میں کامیاب زندگی گزار سکتا ہے اور نہ ہی آخرت کی زندگی میں نجات حاصل کرسکتا ہے۔ اس لیے قرآن مجید کو

سمجھنا اور اس کا فہم حاصل کرنا ہر انسان اور خصوصاً ہر مسلمان کے لئے واجب ہے۔ پھر فہم قرآن کی بھی دو صورتیں ہیں ایک عام اور ایک خاص یا ایک آسان اور دوسری مشکل۔

پہلی صورت یہ ہے کہ انسان قرآن کا ایسا فہم حاصل کرے کہ قرآن مجید میں جو عقائد اور ترغیب وترھیب (یعنی گزشتہ اقوام کے واقعات، ان کی سرکشیاں، ان کا انجام وغیرہ) سے متعلق باتیں ہیں اور جو اوامر ونواہی ہیں اور جن اخلاق حسنہ کی تعریف کی گئی ہے اور جن اخلاق سیئہ کی مذمت کی گئی ہے اور دوسرے لوگوں کے جو حقوق بیان کئے گئے ہیں انسان ان کو سمجھ کر ان کو اپنا سکے۔ قرآن اس حوالے سے بالکل آسان ہے خود اللہ تعالیٰ نے سورۃ القمر میں چار بار فرمایا ہے کہ ہم نے نصیحت حاصل کرنے کے لئے قرآن کو آسان کر دیا ہے اور آگے قرآن میں غور وفکر کرنے پر ابھارنے کے لئے بہت پیارے انداز میں سوال فرمایا: پس ہے کوئی سوچنے والا نصیحت حاصل کرنے والا۔ اور ہمارا مقصود بھی یہی ہے کہ ہر مسلمان پر کم از کم قرآن کا اتنا فہم حاصل کرنا واجب ہے۔ دوسری صورت فہم قرآن کی یہ ہے کہ انسان قرآن کے علوم و معارف، فصاحت و بلاغت کی گہرائی و باریکی میں مہارت حاصل کرے اور اس قابل ہو جائے کہ قرآن کریم سے مسائل کا استنباط کر سکے اور قرآنی مسائل پر کلام کر سکے تو یہ مقام ہر کسی کے بس کی بات نہیں اور نہ ہی ہر مسلمان سے یہ مطلوب ہے بلکہ جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے کہ قرآن کریم کے نزول کا ایک بنیادی مقصد یہ ہے کہ انسان اس سے ہدایت و نصیحت اور عبرت حاصل کرے۔ قرآن کو سمجھ کر پڑھنے کی ضرورت و اہمیت اور فضیلت پر ذیل میں قرآن و حدیث کی روشنی میں چند سطور پیش خدمت ہیں تاکہ ہمیں اس موضوع کی اہمیت کا علم ہو سکے۔

''قرآن آسان ہے'' کی وضاحت

☆ ولقد یسرنا القرآن للذکر فھل من مدکر (القمر 17:، 22، 32، 40)

اور بے شک ہم نے قرآن کو نصیحت حاصل کرنے کے لیے آسان کر دیا ہے تو کوئی ہے نصیحت حاصل کرنے والا؟

''ذکر'' کا لفظ یاد کرنے اور عبرت حاصل کرنے کے معنوں میں آتا ہے اس جگہ دونوں معنی مراد لیے جا سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس قرآن کے الفاظ کو ایسا سہل بنا دیا کہ پانچ چھ سال کا بچہ بھی اسے مکمل حفظ کر لیتا ہے اور عبرت و نصیحت کے اعتبار سے بھی ایسا سہل اور عام فہم بنا دیا کہ ہر ایک عامی و جاہل اور عالم و فاضل اس میں بیان کردہ واقعات و امثال سے عبرت حاصل کر سکتا ہے اور قرآن کا ایک بنیادی مقصد بھی یہی ہے باقی رہا قرآن سے مسائل کا استنباط تو وہ دین کا گہرا علم رکھنے والے اہل علم کا کام ہے۔

☆ علامہ انور شاہ کشمیریؒ قرآن کے سہل ہونے کے بارے میں فرماتے ہیں: ''قرآن کے سہل ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ قرآنی معارف و گہرائیوں تک ہر ایک کی رسائی ممکن ہے بلکہ حق تعالیٰ کی مرضی کے مطابق زندگی گزارنے کا جو طریقہ قرآن میں پیش کیا گیا ہے اس کا ذکر اس انداز سے کیا گیا ہے کہ کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ میری سمجھ میں نہیں آیا اس بارے میں قرآن کا طریقہ خطاب اتنا واضح، صاف، شستہ اور روشن ہے کہ کوئی سمجھنا ہی نہ چاہے تو دوسری بات ہے ورنہ قرآن اپنی حجت پوری کر چکا ہے''۔ (احاطہ دارالعلوم میں بیتے ہوئے دن از مولانا مناظر احسن گیلانیؒ، ص: 114)

☆ ڈاکٹر محمود احمد غازیؒ قرآن کی تدریس کے لئے مدرسہ کے دس سالہ نصاب کے ضروری ہونے کے بارے میں کچھ علماء کی رائے کے بارے میں اپنا نقطہ نظر بیان فرماتے ہیں: ''میں اس خیال سے اتفاق نہیں کرتا، میں یہ سمجھتا ہوں کہ قرآن مجید کو نہ کسی بنیاد کی ضرورت ہے نہ بیساکھیوں کی، قرآن مجید بنیاد بھی فراہم کرتا ہے، دیواریں بھی فراہم کرتا ہے، اور تعلیم کی تکمیل

بھی کر دیتا ہے۔

قرآن مجید خود اپنی جگہ ایک مکمل کتاب ہے، وہ کسی کا محتاج نہیں ہے۔ باقی علوم قرآن مجید کے محتاج ہیں۔ اس لیے مجھے اس دلیل سے اتفاق نہیں ہے۔ ممکن ہے بعض لوگ آپ سے کہیں کہ آپ نے فقہ اور اصول فقہ کا علم حاصل نہیں کیا، یا آپ نے علم الکلام نہیں پڑھا، اس لئے آپ کو درس قرآن کی ذمہ داری نہیں اٹھانی چاہیے۔ مجھ ناچیز کا مشورہ یہی ہے کہ آپ اس وسوسہ میں نہ پڑیں اور اپنا کام جاری رکھیں۔ میں خود فقہ کا طالب علم ہوں، فقہی موضوعات پر ہی پڑھتا پڑھاتا ہوں لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ قرآن فہمی فقہ کی محتاج نہیں، یہ تمام علوم قرآن پاک کے محتاج ہیں قرآن ان میں سے کسی کا محتاج نہیں۔ اس لئے آپ کسی کی پرواہ کئے بغیر اپنا کام جاری رکھیں''۔ (محاضرات قرآنی، ص:43)

جسے گرم روزے کی پیاس متقی نہ بنا سکی
اسے اور کیا چیز متقی بنا سکتی ہے؟
جسے ٹھنڈے پانی کا افطار شکر گزار نہ بنا سکا
اسے اور کیا چیز شکر گزار بنا سکتی ہے؟

اہم یہ نہیں کہ رمضان میں آپ نے کیا اعمال کیے
اہم یہ ہے کہ رمضان کی تربیت نے آپ کو کیسا بنادیا

مبشر نذیر

ترکی کا سفرنامہ (33)

تھوڑی دیر کے بعد اچانک چڑھائی شروع ہوگئی۔ چڑھائی کے ساتھ ساتھ دریا کے شور میں بھی اضافہ ہو رہا تھا کیونکہ یہ اب زیادہ تیزی سے نیچے کی طرف جا رہا تھا۔ تھوڑی سی چڑھائی کے بعد اچانک سڑک سیدھی ہوگئی۔ سامنے مسجد کا مینار نظر آ رہا تھا۔ دریا اب پرسکون ہو چکا تھا۔ ایک موڑ مڑتے ہی ہمارے سامنے ترکی کا حسین ترین منظر تھا۔ یہ یوزن جھیل تھی جو اپنے حسن کے لحاظ سے پورے ترکی میں مشہور تھی۔ ترابزن کے بروشر میں جس منظر نے ہمیں مسحور کیا تھا، وہ اب نگاہوں کے سامنے تھا اور حقیقتاً اپنی تصویر سے بڑھ کر دلفریب تھا۔

جھیل کے ایک کنارے پر سڑک تھی جس پر دکانیں وغیرہ بنی ہوئی تھیں۔ دوسرے اور تیسرے کنارے پر ہوٹل تھے مگر ہوٹلوں اور جھیل کے درمیان ایک کچی سڑک تھی۔ چوتھی جانب خالی تھی۔ جھیل کے شمالی کنارے پر ایک بہت ہی خوبصورت مسجد بنی ہوئی تھی۔ جھیل کے بیچوں بیچ ایک ننھا منا سا جزیرہ تھا جو گھنے سبزے سے ڈھکا ہوا تھا۔ اس کا سائز کچھ اتنا ہی تھا جتنا کہ ہماری کلری جھیل میں نوری جام تماچی کا مقبرہ بنا ہوا ہے۔ جھیل کے ایک جانب سے دریائے یوزن نکل رہا تھا۔ چاروں طرف سبزے سے ڈھکے ہوئے پہاڑ تھے جن کی چوٹیاں بادلوں سے ہم آغوش ہو رہی تھیں۔

اس جھیل کے منظر کا موازنہ اپنی جھیل سیف الملوک سے کیا جا سکتا ہے مگر یہاں فرق یہ تھا کہ جھیل کے چاروں طرف لکڑی کے بہت سے ہٹس بنے ہوئے تھے۔ یہ جھیل اتنی بلندی پر بھی نہ تھی جتنی بلندی پر سیف الملوک واقع ہے۔ پہلی نظر ہی میں ہم اس جھیل پر عاشق ہو چکے تھے چنانچہ فیصلہ یہ ہوا کہ اگلے دو تین دن یہیں بسر کیے جائیں۔ ویسے بھی اب ہم استنبول سے

1300 کلومیٹر کا سفر طے کر چکے تھے۔

جھیل کے کنارے بہت سے لوگ تھے جن میں سعودیوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ان میں سے زیادہ تر حضرات اپنی جیپوں اور کاروں پر سعودی عرب سے آئے تھے۔ان کی خواتین نے برقعے پہنے ہوئے تھے جس کی وجہ سے ماحول پاکیزہ لگ رہا تھا۔ترکی کے مغرب زدہ ماحول کی وجہ سے ہمیں جو گھٹن محسوس ہو رہی تھی، اس کا بھی یہاں خاتمہ ہو گیا تھا۔ ہمارے ہاں عربوں کا تصور یہ ہے کہ یہ اپنے ممالک سے باہر جا کر خوب عیاشی کرتے ہیں۔یہ تصور بالکل ہی غلط ثابت ہوا۔ یہاں موجود تمام عرب نہایت ہی شرافت سے انجوائے کر رہے تھے۔ان کی خواتین بھی مکمل باپردہ تھیں اور مردوں کی نظر میں بھی حیا تھی۔ترک خواتین بھی باپردہ نظر آ رہی تھیں۔

ابھی بہت کچھ باقی ہے!

اس صورت حال سے متعلق ہم آپس میں گفتگو کرنے لگے۔اہل مغرب کا کلچر مسلم معاشروں میں پھیلانے کے لئے کس درجے کی کوششیں کی گئی ہیں۔میڈیا کی پوری طاقت کو اس کام پر لگا دیا گیا کہ دنیا میں بے حیائی کو عام کیا جا سکے۔سینما، ٹی وی، رسائل و میگزین، انٹرنیٹ، تھیٹر غرض ہر قسم کے میڈیا کے ذریعے بے حیائی کے فروغ کا کام لیا جانے لگا۔مصر اور پاکستان جیسے ممالک میں سرکاری طور پر بے حیائی کے کاروبار کی سرپرستی کی گئی۔ترکی میں حکومتی جبر کے زور پر بے حیائی کو مسلط کیا گیا۔اس سب کے باوجود مغربی کلچر پوری طرح ہمارے معاشروں میں سرایت نہیں کر سکا ہے۔اب بھی ہمارے ہاں ایسے خواتین و حضرات کی کمی نہیں ہے جن کے نزدیک حیا اور عفت و عصمت بنیادی اقدار کی حیثیت رکھتی ہیں۔مناسب ہو گا اگر ہم اس موقع پر بے حیائی کی تاریخ کا مختصر جائزہ لے لیں۔

[جاری ہے]

پروین سلطانہ حنا

زندگی چاہت کے لیے تھوڑی ہے

منافرت کی کمین گاہوں میں رہنے والو!
یہ وقت اپنی اڑان میں ہے
کہ تیر جیسے کمان میں ہے
تم اپنی عمروں کی برف دیکھو
جو لمحہ لمحہ پگھل رہی ہے
جو سرد پانی میں ڈھل رہی ہے
محبتوں کے لئے نہیں ہے
مجھے میّسر ذرا سی فرصت
عداوتوں کے لئے کہاں سے
خرید لائے ہو اتنی مہلت
مرے خیالوں کی رہگزر پر
اک ایسا چشمہ ابل رہا ہے
کہ جس کی شیریں حلاوتوں سے
پیا سے من کو قرار آئے
غرور و نفرت کے خارزاروں پہ
دھیرے دھیرے بہار آئے
خدا کرے اس حسین چشمے کی رو میں آ کر
تمام بہہ جائیں ظلم و نفرت کی قتل گاہیں
نکھرتے جائیں زمیں کے موسم
ابھرتی جائیں نئی فضائیں

ابویحییٰ کی کتابیں

آخری جنگ

شیطان کے خلاف انسان کا اعلان جنگ

حکمت کی باتیں

حکمت کی وہ باتیں جو دنیا و آخرت میں کامیابی کی ضامن ہیں

ملاقات

اہم علمی، اصلاحی، اجتماعی معاملات پر ابویحییٰ کی ایک نئی فکر انگیز کتاب

کھول آنکھ زمین دیکھ

مغرب اور مشرق کے سات اہم ممالک کا سفرنامہ

جب زندگی شروع ہوگی

ایک تحریر جو ہدایت کی عالمی تحریک بن چکی ہے

قسم اس وقت کی

ابویحییٰ کی شہرہ آفاق کتاب ''جب زندگی شروع ہوگی'' کا دوسرا حصہ

Please visit this link to read all articles and books of Abu Yahya free online.

www.inzaar.org

To get Abu Yahya Quotes Join us on twitter:

Twitter ID: @AbuYahya_inzaar

To read Abu Yahya articles regularly Join us on Facebook

Abu Yahya Page: www.facebook.com/abuyahya.inzaar

Abu Yahya Account: www.facebook.com/abuyahya.jzsh

Join us on Youtube

Search inzaar on YouTube to see our audios and lectures

To get monthly books, CDs/USB and Inzaar's monthly magazines at home anywhere in Paksitan, contact # 0332-3051201 or 0345-8206011

To participate in online courses, visit

www.inzaar.org/online-courses/

To get any other information, email to globalinzaar1@gmail.com

Following material in audio form is available on USB/CD:

Quran Course by Abu Yahya

Quran Translation and Summary by Abu Yahya

Islahi Articles

Jab Zindagi Shuru Hogi (book)

Qasam Us Waqt Ki (book)

Aakhri Jang (book)